www.urducouncil.nic.in
قیمت : ₹ 15/-

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

نئی دہلی

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اکتوبر 2026

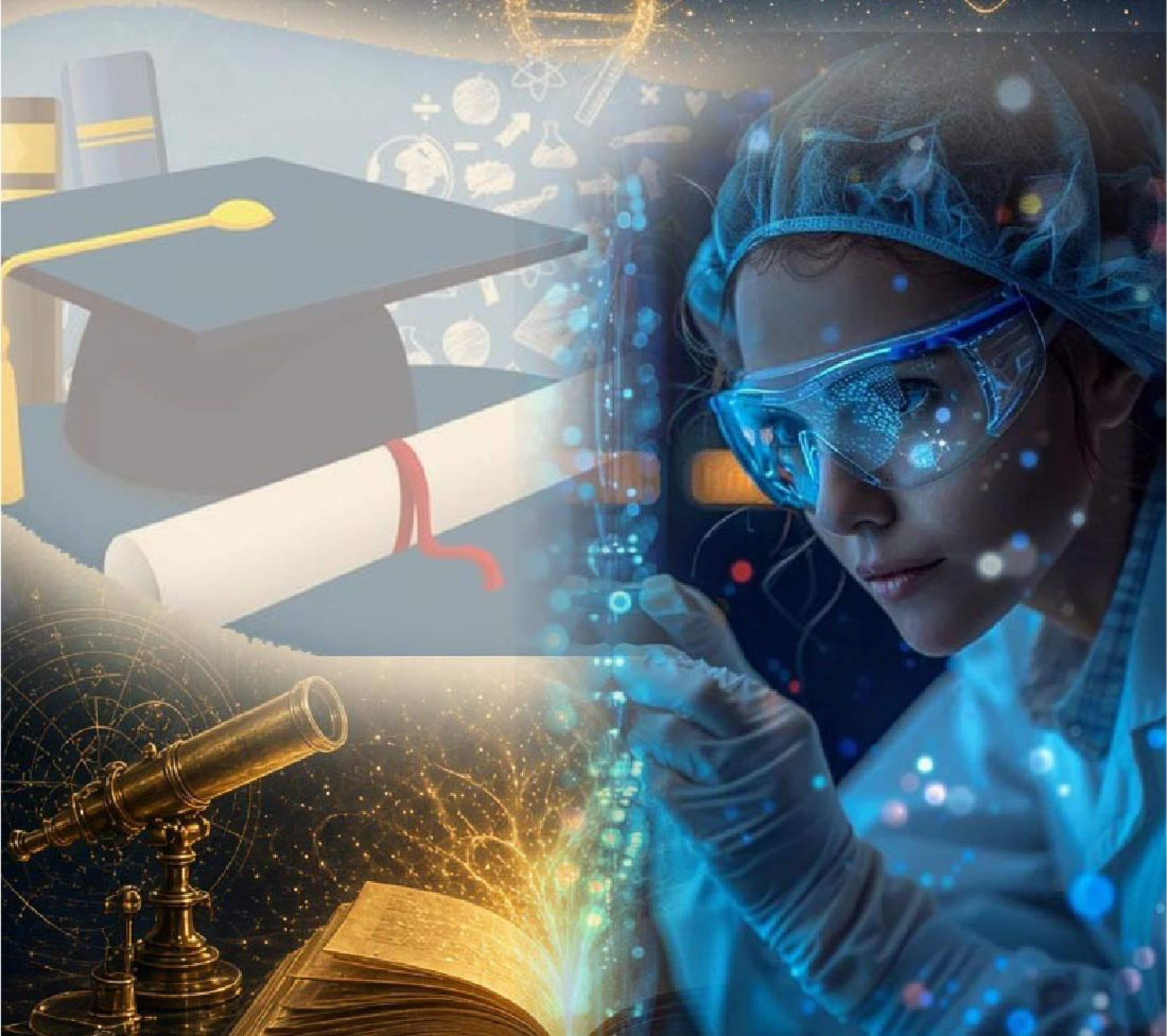

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ♦ زبان شناسی
- میرا بچپن ♦ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 :A/C، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ		
مشعل	مدیر	4
جہانِ نسواں		
ادبی صحافت اور رسالہ شب خون	خوشتر زریں ملک	5
شمیم علیم کے انشائیوں 'بکھرے موتی' کا فکری وفنی مطالعہ	پنکج کمار	10
بلقیس ظفیر الحسن: نسائی شعور اور تہذیب کی امین	سیدہ ایمن عبدالستار	14
اردو صحافت پر ڈیجیٹل میڈیا کے اثرات	شاہدہ کوثر	18
علی گڑھ تحریک کے تناظر میں تعلیم نسواں	ثنا مریم	22
منچندا بانی کی شعری انفرادیت	ہما کوثر	26
جموں وکشمیر کی منتخب خودنوشتوں کا اسلوبیاتی مطالعہ	رفعت اختر	29
سائنس اور خواتین: تاریخ، خدمات اور امکانات	فیضان احمد کیفی	34
ارجنٹائنا کی خواتین نے تیسری مرتبہ ہاکی عالمی کپ جیتا	سیدہ پرویز قیصر	40
حسنِ سخن		
غزل	خوشبو پروین	43
غزل	فوزیہ اختر ازکیٰ	43
غزل	عذرا انجم	44
نظم	نورینہ پروین	44
افسانے		
پہچان	زیبا ناز	45
تو ہم سفر	نیلوفر سعدیہ	51
حسن کی نگہداشت		
تل: دربارِ حسن	ابوطالب انصاری	57
خواتین خبرنامہ		60
قارئین کے خطوط		
ارتباط		62

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا نئی دہلی

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 10 شمارہ: 10 اکتوبر 2026

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: میکاف پرنٹرس، B-127، سیکٹر 65

نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/15 روپے، سالانہ -/145 روپے

صفحات: Total Pages **64**

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 011-35151992

شعبۂ ادارت: 011-35152009

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجدیار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

علم کی تاریخ دراصل انسانی جستجو، سوال اور دریافت کی تاریخ ہے۔ انسان نے جب اپنے گرد و پیش کی دنیا کو سمجھنے، فطرت کے اسرار دریافت کرنے اور زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی تو سائنس کا سفر شروع ہوا۔ یہ سفر کسی ایک قوم، معاشرے یا جنس تک محدود نہیں رہا۔ خواتین نے بھی علم و تحقیق کے مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے اور سائنس کی ترقی میں ان کا کردار تاریخِ علم کا ایک اہم باب ہے۔ خواتین کی علمی و ادبی خدمات کی روایت بہت قدیم ہے۔ انھوں نے زبان و ادب کو وسعت دی، تعلیم کے فروغ میں حصہ لیا، سماجی شعور بیدار کیا اور اپنے تخلیقی اظہار کے ذریعے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ساتھ ہی طب، ریاضی، طبیعیات، حیاتیات، فلکیات، کیمیا، کمپیوٹر سائنس اور خلائی تحقیق سمیت سائنس کے تقریباً ہر شعبے میں خواتین نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔

قدیم تاریخ میں رفیدہ الاسلمیہ کا نام طب اور مریضوں کی نگہداشت کے حوالے سے اہمیت رکھتا ہے، جب کہ سطیطہ المحملی کی علمی خدمات ریاضی کے میدان میں خواتین کی شرکت کی نشان دہی کرتی ہیں۔ جدید دور میں میری کیوری نے طبیعیات اور کیمیا میں نمایاں تحقیق کی، روزالِنڈ فرینکلن نے DNA کی ساخت کے مطالعے میں اہم کردار ادا کیا اور جین گڈال نے حیوانی رویوں کے مطالعے کو نئی جہت عطا کی۔ ہندوستانی خواتین نے بھی سائنس کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ آنندی بائی جوشی نے طب کی تعلیم حاصل کر کے خواتین کے لیے ایک نئی راہ ہموار کی، جب کہ اسیما چٹرجی نے کیمیا اور ادویاتی تحقیق میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ جدید ہندوستان میں گگن دیپ کنگ، ٹسی تھامس اور ریتو کریدھل جیسی سائنسداں خواتین کی کامیابیاں اس روایت کو آگے بڑھا رہی ہیں۔

سائنس محض تجربہ گاہوں اور آلات کا نام نہیں، بلکہ سوال، مشاہدہ، تجربہ اور دلیل کے ذریعے حقیقت تک پہنچنے کا طریقہ و رویہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین کی تعلیم میں سائنسی شعور کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ایک ایسی لڑکی جو سوال کرنا، تحقیق کرنا اور اپنے نتائج اخذ کرنا سیکھتی ہے، وہ نہ صرف اپنے مستقبل کو بہتر بناتی ہے بلکہ معاشرے کی فکری ترقی میں بھی حصہ لیتی ہے۔ ادب اور سائنس بظاہر الگ الگ میدان ہیں، لیکن دونوں کی بنیاد انسانی جستجو اور تخیل پر قائم ہے۔

آج دنیا مصنوعی ذہانت، خلائی تحقیق، ماحولیاتی تبدیلی، حیاتیاتی ٹیکنالوجی اور صحت کے نئے مسائل سے دوچار ہے۔ ان چیلنجوں کا مقابلہ اسی وقت ممکن ہے جب مردوں کے شانہ بشانہ خواتین کو بھی تعلیم، تحقیق اور سائنسی سرگرمیوں میں برابر کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ اس لیے کہ جب ایک عورت علم حاصل کرتی ہے تو وہ صرف اپنی زندگی کو روشن نہیں کرتی بلکہ اپنے خاندان، معاشرے اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی نئے امکانات پیدا کرتی ہے۔

آپ کا

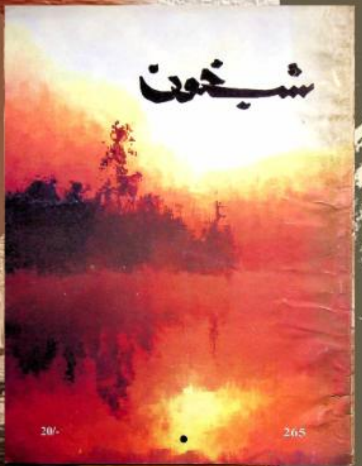

ادبی صحافت اور رسالہ شب خون

خوشتر زریں ملک

انیسویں صدی میں ہندستان میں جب نئے انگریزی نظام کی داغ بیل پڑی تو اسی کے ساتھ کئی نئی چیزیں ہندستان میں متعارف ہوئیں، انھیں میں سے ایک صحافت ہے جس کے بعد الگ الگ شعبہ بن گئے اور ایک اہم شعبہ ادبی صحافت کہلایا۔ ادبی صحافت نے عام صحافت سے کئی معنوں میں مختلف کام کی کی ادب کو فروغ دینے اور ذخیرہ کرنے کا کام کیا۔ پرانے ادب کو نئے زاویے سے دیکھا اور اس نئی تعبیریں پیش کیں۔ جب ہم رسالے شب خون کو اس تناظر میں دیکھتے ہیں تو ہماری حیرت اپنی انتہا کو پہنچنے لگتی ہے۔ ہم اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ شب خون کی طویل عمر سے پہلے کی ادبی دنیا اور اس کے جاری ساری ہونے اور اپنے انجام کو پہنچنے تک کی تاریخ کا موازنہ ہمیں کئی ایسے نتائج تک لے جاتا ہے جو ہماری ادبی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔

شب خون کا آغاز 1966 کے جون سے ہوتا ہے۔ ترقی پسند نقاد سید اعجاز حسین صاحب نے اس رسالے کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی جسے وہ تا دیر جاری نہ رکھ سکے۔ شب خون اپنے آغاز سے ہی خود کو کسی ایک نظریے یا رجحان تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کی وسعت اور تنوع کو ترجیح دی۔ بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شب خون چوں کہ جدیدیت کا نمائندہ رسالہ ہے اس لیے اسے ترقی پسند اور ترقی پسندی دونوں سے پرہیز رہا ہوگا لیکن ہم جب شب کے خون کے پہلے شمارے میں شامل ادیبوں کی فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ جدید سالہ اور ترقی پسند ادیبوں کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ شب خون کے پہلے شمارے کے تخلیق کاروں کے نام دیکھیے:

فراق گورکھپوری، احتشام حسین، خلیل الرحمان اعظمی، عمیق حنفی، مسیح الزمان، سلیمان اریب، اپندر ناتھ اشک،

’شب خون‘ کا پہلا شمارہ بابت ماہ جون 18، 1966 کو منظر عام پر آیا، مدیر کی حیثیت سے ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا انتخاب کیا گیا۔ اداریے کے علاوہ پروفیسر سید احتشام حسین، فراق گورکھپوری، حبیب احمد صدیقی، اپندر ناتھ اشک، رام لعل، خلیل الرحمن اعظمی، مسیح الزماں، سلیمان اریب، اور عمیق حنفی کی تخلیقات اس میں شامل تھیں۔ ماہنامے میں جو کالم بنائے گئے وہ اس طرح تھے: جدید فرانسیسی نظمیں، روسی افسانہ، ہندی افسانہ، بھیانک افسانہ، نفسیات جنسی، کتابیں، کہتی ہے خلق خدا، سوانحی گوشے، اخبار واذکار اور ہندوستانی موسیقی وغیرہ۔ مسلسل چالیس برس تک جاری رہنے والے اس رسالے کے کل 299 شمارے شائع ہوئے، جون 2005 میں شب خون کی اشاعت بند کر دی گئی۔ مدیر، نائب مدیر اور ترتیب وتہذیب کے حوالے سے قمر احسن، ساقی فاروقی، محمود ہاشمی، عقیلہ شاہین وغیرہ کئی نام شب خون کی پیشانی پر درج ہیں لیکن یہ حقیقت کسی سے چھپی نہیں ہے کہ اس کے روح رواں از اول تا آخر شمس الرحمن فاروقی ہی رہے، یہ انھیں کا فکری پرتو ہے۔ ’شب خون‘ کے اجرا کے وقت پاکستان سے رسائل وجرائد کی آمد سیاسی کش مکش کی بنا پر ست پڑ چکی تھی، لکھنے پڑھنے

والوں میں کم حوصلگی کا زہر سرایت کر جانے کے سبب حوصلہ افزائی کے راستے محدود ہو رہے تھے۔ ادب کی رہ گذر کو روشن کرنے والے علمی و ادبی رسالوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ پرانے لکھاریوں کی اچھی تخلیقات ناپید ہوتی جا رہی تھیں لہٰذا تجربہ کار قلمکاروں اور نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کے لیے رسالے کی کمی محسوس ہو رہی تھی، الہ آباد کے کچھ باہمت ادیبوں اور چند دیگر احباب نے ماہنامہ نکالنے کی فکر کی، بوڑھے جوان سبھی محفل میں شریک ہوئے اور اس خیال پر لبیک کہا۔ مالی تعاون کے لیے جمیلہ فاروقی نے ہاتھ بڑھایا جو اس وقت قدوائی گرلس کالج الہ آباد کی پرنسپل تھیں، بالآخر 'شب خون' وجود میں آیا۔

1955 کے بعد ہی سے اردو ادب میں نئی آوازیں اٹھنے لگی تھیں، 1960 میں اردو شعر و ادب میں ترقی پسندی کے برخلاف ایک نئے رجحان نے جنم لیا، صنعتی و سائنسی پیش رفت اور مغربی علوم کی ترقی نے انسانی معاشرے میں بحرانی صورت حال کو جنم دیا۔ ایسے میں شعرا و ادبا نے روایتی شعر و ادب سے انحراف کر کے اظہار کے لیے نئے وسیلوں کو تلاش کیا تاکہ موجودہ دور کے پیچیدہ مسائل اور نفسیاتی کشمکش کو احاطۂ بیان میں لایا جا سکے۔ چنانچہ 1960 کے بعد نظریاتی و تخلیقی رجحانات میں بدلتی ہوئی فضا دکھائی دینے لگی اور جلد ہی یہ تبدیلی جدیدیت کے غالب رجحان کی صورت اختیار کر گئی۔ مارکسیت کے بعد ادبی افق پر جدیدیت کا رجحان ہی سب سے قوی ثابت ہوا۔ تخلیق کاروں کی نئی نسل نے ہیئت اور موضوع کے نئے نئے تجربات کیے، اظہار کے نئے سانچوں کی تلاش میں لسانی تشکیل کا سہارا لیا۔ ادب میں پیچیدہ مسائل کو موضوع بنانے کے سبب اظہار میں بھی پیچیدگی در آئی جس نے ابہام، علامت، تجرید، استعارہ سازی، داخلیت اور لفظ کی ثنویت کو جنم دیا۔ ادب کی تخلیق کے لیے جدید عناصر کے استعمال کی ایسی فضا بنی کہ روایتی شاعر و ادیب بھی جدید لفظیات کا سہارا لینے لگے اور جدید معاشرے میں پھیلے ہوئے پیچیدہ مسائل سے بھری پڑی زندگی سے نادر تجربات کی تلاش میں نکل پڑے۔ 'شب خون' انھیں تخلیق کاروں کی نئی پود کے لیے اور تازہ تخلیقی رجحان کی ترجمانی کے لیے جاری کیا گیا ایک پلیٹ فارم ہے۔ ڈاکٹر انور سدید شب خون کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''1965 کی جنگ کے بعد سرحدیں بند کر دی گئی تھیں، اور دونوں اطراف کے سیاست دان عوام الناس کے جذبات و احساسات کو یکسر نظر انداز کر کے تنگ نظری کو فروغ دے رہے تھے اور نفرتیں پھیلا رہے تھے۔ اس کشیدہ فضا میں شمس الرحمن فاروقی نے 'شب خون' اور وزیر آغا نے 'اوراق' جاری کیا تو بالواسطہ طور پر دونوں نے اردو ادب کی قدیم روایت کے مثبت زاویوں کو قائم رکھتے ہوئے جدید ادب کو متعارف کرانے اور سینئر ادیبوں کے احترام اور وقار میں اضافہ کرنے اور ان سے راہنمائی حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے ساتھ ہی نئی نسل کے ابھرتے ہوئے نوجوانوں کو ادب کی طرف راغب کرنے اور ان کے مادی باطن سے روحانی شخصیت بازیافت کرنے کی کوشش بھی کی۔''

(سہ ماہی روشنائی [فاروقی نمبر] جولائی تا ستمبر، 2003، ص 227، کراچی)

اردو کی ادبی صحافت میں 'شب خون' اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ شب خون ادبی جمود و تخلیقی تعطل کے احیا اور مارکسی نظریات پر شب خون مارنے کی غرض سے جاری کیا گیا۔ شب خون نے اولاً 'ادب برائے ادب' یا 'فن برائے فن' کا نعرہ بلند کیا، اس کے بعد ادیب و فنکار کی فکری و تخلیقی آزادی کی وکالت کی، سیاسی و سماجی وابستگی، اصول و قوانین کی پابندیوں کو ادیب کے لیے معیوب گردانا تاکہ وہ پوری طرح آزاد رہ کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکے۔ ڈاکٹر انیس صدیقی لکھتے ہیں:

''شب خون نے قلم کاروں کو تعطل، جمود، نظریاتی حصار بندی، فارمولا بازی، ازم، مینی فیسٹو کی کال کوٹھری سے نکال کر آزاد فضاؤں میں سانس لینے کے مواقع فراہم کیے۔''

(شب خون کا توضیحی اشاریہ، جلد اول، ص 22، ناشر: قومی اردو کونسل، نئی دہلی 2017)

شب خون کے اپنے متعینہ مقاصد تھے جو ادب کے حوالے سے خلوص پر مبنی تھے، تجارتی منفعت، مقابلہ آرائی، خودنمائی یا تقلید سے

اس کا تعلق نہیں تھا، شب خون نے ابتدائی دور میں ہی خاصی مقبولیت حاصل کر لی تھی جس کے پیچھے اس کی نادر تخلیقات، فکر انگیز مضامین، بہترین تراجم اور دنیا جہان کی فلسفیانہ و نظریاتی بحثیں کارفرما تھیں جو اردو کے قارئین کے لیے نادر تھیں، اب قارئین کی نظر میں 'شب خون' صرف ماہنامہ نہیں بلکہ ایک زاویۂ نگاہ بن گیا تھا جس نے ادب کی تخلیق کے لیے نئے معیارات اور ادب کی تفہیم کے لیے راستے کشادہ کیے، شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

''میں نے شب خون کا اجرا کئی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کیا تھا۔ ایک تو یہ کہ نئے ادب کو فروغ دینا تھا اور اس بات کی تردید کرنی تھی کہ ترقی پسندی ادب کے زوال یا اس کے کمزور پڑ جانے کے بعد ہمارے ادب میں جمود آ گیا تھا۔ چنانچہ اس کا پہلا اشتہار جو پروفیسر احتشام حسین نے بنایا تھا۔ اس کے الفاظ تھے 'کیا ادب میں جمود ہے'؟ اس کا جواب ہے 'شب خون'۔ لفظ 'شب خون' کی معنویت آپ پر عیاں ہو گئی، یہ اشتہار ہم لوگوں نے ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا اور ڈاک سے بھیجا۔ دوسرا مقصد تھا الہ آباد کے نئے لکھنے والوں کو سامنے آنے کا موقع فراہم کرنا۔ تیسرا مقصد تھا ادب میں نظری مباحث قائم کرنا اور ادب کی نوعیت پر ہر پہلو سے غور و فکر کے لیے میدان مہیا کرنا۔ چوتھا مقصد جو پہلے مقصد ہی کا حصہ کہا جا سکتا ہے، یہ تھا کہ ادب میں نئے تجربات کو فروغ دیا جائے۔ پانچواں مقصد تھا ہندوستان اور غیر ملکوں کی زبانوں کے اچھے ادب کے نمونے تراجم کے ذریعے پیش کرنا۔ چھٹا مقصد تھا ایک ایسا رسالہ جاری کرنا جس میں چھپنے کی وہی توقیر ہو جو بڑے پاکستانی پرچوں مثلاً 'سویرا' یا 'نیا دور' میں چھپنے پر حاصل ہوتی ہے۔''

(بحوالہ: شب خون کا توضیحی اشاریہ، جلد اول، ص 23، ناشر: قومی اردو کونسل 2017)

شب خون کو ایک پلیٹ فارم کے طور پر قائم کیا گیا تھا جس کا مقصد ادب میں نظری مباحث قائم کرنا اور نئے لکھنے والوں کی تخلیقات کے لیے اشاعت کا موقع فراہم کرنا تھا، ابتدائی دور میں ہی شب خون میں لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کا ایک مضبوط حلقہ بن گیا۔ شب خون میں موضوعاتی، فکری اور تخلیقی تنوع ایسا دل چسپ تھا کہ عوام و خواص اس کے اسیر ہوتے چلے گئے۔ ہندوستانی شعر و ادب، تہذیب و ثقافت، آرٹ اور مصوری کے تعلق سے متنوع مضامین نے علمی و ادبی حلقے میں نئی جوت جگا دی۔ اورنگ آباد سے قاضی سلیم اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''شب خون نے پانچ شماروں ہی میں ہندوستان کی ادبی فضا کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے رسالے کو ابدیت کے چکر میں ڈالنے کے بجائے بدلتے ہوئے وقت کے زندہ مسائل کا آئینہ دار بنایا ہے۔''

(شب خون، شمارہ نمبر 7، بابت ماہ دسمبر 1966، ص 76)

شب خون کو اس مقبولیت تک پہنچنے اور قارئین کی داد و تحسین جیتنے میں بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، مالی دشواریوں کے علاوہ ادبی حریفوں کے سخت اختلافات بھی راہ کا روڑا بنے، ترقی پسندوں نے 'شب خون' کو زیر کرنے کے لیے رجعت پرستی، سیاسی شعور کے

''شب خون کو کاؤنٹر کرنے کے لیے مقابل میں کئی رسائل بھی جاری کیے گئے لیکن 'شب خون' نے تمام الزامات سے نہ صرف دامن بچایا بلکہ اپنے نظریۂ ادب کو فروغ دینے کے لیے نہایت جرأت کے ساتھ ثابت قدم رہا۔ شب خون کی اس بے مثال کامیابی کے پیچھے جتنا شمس الرحمن فاروقی کا حصہ ہے اتنا ہی محترمہ جمیلہ فاروقی [بیگم شمس الرحمن فاروقی] کا حوصلہ اور تعاون بھی کارفرما ہے''

فقدان، اہمال پرستی، سماجیت سے فرار اور قاری کی ضروریات سے بے نیازی جیسے الزامات لگائے۔ شب خون کے بارے میں کہا گیا کہ اس کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہے (حوالہ: شب خون، شمارہ 293، ص 619) شب خون کو کاؤنٹر کرنے کے لیے مقابل میں کئی رسائل

بھی جاری کیے گئے لیکن 'شب خون' نے تمام الزامات سے نہ صرف دامن بچایا بلکہ اپنے نظریۂ ادب کو فروغ دینے کے لیے نہایت جرأت کے ساتھ ثابت قدم رہا۔ شب خون کی اس بے مثال کامیابی کے پیچھے جتنا شمس الرحمن فاروقی کا حصہ ہے اتنا ہی محترمہ جمیلہ فاروقی [بیگم شمس الرحمن فاروقی] کا حوصلہ اور تعاون بھی کارفرما ہے۔

'شب خون نے کبھی اپنے مضامین و تخلیقات کے انتخاب میں تعصب، مروت، مصلحت یا پھر جانب داری سے کام نہیں لیا بلکہ ہر وہ تحریر جو رسالے کے مزاج و معیار پر کھری اتری اسے شامل اشاعت کرنے میں کسی طرح کا تردد نہیں کیا گیا'

'شب خون' چالیس سال تک پوری آن بان سے چھپتا رہا، ادبی صحافت کی تاریخ میں 40 سال کا طویل عرصہ بہت اہمیت کا حامل ہے، اردو کے ادبی رسائل کی اوسط عمر دس سال سے زیادہ نہیں ہوتی، ماہانہ ہونے کے سبب چالیس سال کی مدت میں 480 شمارے چھپنے چاہیے تھے لیکن 299 ہی چھپ سکے، بیچ میں رسالہ دوماہی اور سہ ماہی کی حیثیت سے بھی چھپا، 1973 سے 1994 کے بیچ شب خون کبھی دوماہی تو کبھی سہ ماہی طور پر شائع کیا گیا، جبکہ آخری شمارہ سات ماہ پر مشتمل تھا۔ ظاہر ہے اس کے پیچھے مالی یا تنظیمی دشواریاں رہی ہیں۔ فی الجملہ شب خون اپنے مزاج و معیار اور نظریاتی موقف پر قائم رہتے ہوئے بلاناغہ چھپتا رہا۔ شب خون نے کبھی اپنے مضامین و تخلیقات کے انتخاب میں تعصب، مروت، مصلحت یا پھر جانب داری سے کام نہیں لیا بلکہ ہر وہ تحریر جو رسالے کے مزاج و معیار پر کھری اتری اسے شامل اشاعت کرنے میں کسی طرح کا تردد نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ شب خون کے شروعاتی شماروں اور بعد میں بھی متعدد ایسی تحریریں شامل اشاعت کی گئیں جو جدیدیت پر یا جدید تخلیقی رویے پر کی گئی سخت تنقید پر مشتمل تھیں، لیکن فکری پختگی، خوش سلیقگی اور استدلالی انداز سے بھرپور ہونے کے سبب انھیں شائع کرنے میں کوئی تعصب نہیں برتا گیا۔ شمس الرحمن فاروقی شب خون کے معیار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہم نے کسی جگہ اپنے معیاروں کے معاملے میں مصالحت نہ کی اور نہ صدق نیت کے بغیر کوئی کام کیا۔ اردو ادیبوں کا ایک جم غفیر ہے جس کی شناخت 'شب خون' سے بنی۔ ذرا سوچیے کہ اگر شب خون نہ نکلتا اور قائم نہ رہتا تو کیا جدید ادب کی تاریخ وہی ہوتی جو آج ہے۔ وہ نئی، زندہ طاقت ور تخلیقی سرگرمی جو شب خون نے پیدا کی، وہ تنقیدی و نظریاتی مسائل جو شب خون نے اٹھائے، وہ بحثیں اور معرکے جو 'شب خون' کے صفحات پر آراستہ ہوئے، ان کے بغیر آج ہمارا ادب کس قدر پسماندہ اور تنگ دامن ہوتا؟''

('بارے یہ غنیمت ہے کہ جیتا تو رہا ہوں' شب خون، شمارہ 195، بابت ماہ جون 1996، ص 1)

شب خون کی تحریروں کا معیار و منہج اتنا بلند تھا کہ قلمکار اس میں چھپ جانے کو سند امتیاز تصور کرتے تھے، اور یہ کچھ غلط بھی نہ تھا کہ شب خون نے جو معیار متعین کیا تھا اس پر کھرا اترنا جدید ذہنی اپج، تازہ کاری اور شدید مشق کے بغیر ممکن نہ تھا۔ شب خون سے قبل ہی ایسی تخلیقات منظر عام پر آنے لگی تھیں جو جدید نظریۂ ادب سے بے حد قریب تھیں لیکن شب خون میں چھپنے والی تمام تحریروں کو اعتبار نظر صرف اس لیے حاصل تھا کیوں کہ شب خون جدیدیت کا فکری استعارہ بن چکا تھا۔

نئے تجربات پر مشتمل تحریریں اور ادیب کی فکری آزادی کا انعکاس کرنے والی تخلیقات فاروقی کے انتخابی عمل میں پہلے جگہ پاتیں۔ شب خون میں شائع شدہ تخلیقات پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ فاروقی تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں نہایت کفایت شعار رہے ہیں، مثلاً بعض شعرا کے صرف دو۔دو یا تین۔تین اشعار ہی شائع کیے ہیں۔ لیکن معیاری تخلیقات کو شائع کرنے میں فراخ دلی بھی دکھائی ہے۔ بلاشبہ شب خون نے مثبت انداز فکر و نظر، نئے رجحانات کے فروغ اور تخلیقی معروضیت کو اپنے معیار و مزاج کا حصہ بنایا اور آخری دن تک اس پر قائم بھی رہا۔ شب خون نے ادبی تاریخ کو نیا

موڑ دیا۔ اسد ثنائی 'الانصار' کے اداریے میں لکھتے ہیں:

''شمس الرحمن فاروقی نے بہت سے ذہنوں کو صیقل کیا اور ان کی سوچ اور فکر کے دھاروں کو نئی شکل عطا کی۔ انھوں نے پہلے منزل کا تعین کیا پھر چالیس برس تک پورے استحکام کے ساتھ کہیں بھی لڑکھڑائے بغیر اس منزل تک ان ادیبوں کی رہنمائی کی جن کی نگاہوں کے سامنے صرف پامال راستے تھے۔''

(الانصار، جلد 3، شمارہ 3، ص 5-6، ادارہ الانصار، حیدرآباد 2005)

'شب خون' کی آبیاری میں فاروقی کی علمی بصیرت اور ادب شناسی کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر شب خون کی ترتیب وتہذیب اور اس کے مزاج ومعیار کے تعین میں فاروقی کی کدوکاوش نہ ہوتیں تو ہرگز یہ اردو ادب کے دیگر رسائل میں ممتاز شناخت کا حامل نہ ہوتا۔ سنجیدہ حلقوں میں شب خون کی مقبولیت کے پیچھے فاروقی کا تبحر علمی اور پیش کش کا نیا انداز پوشیدہ ہے۔ شب خون کی مقبولیت میں فاروقی کے علاوہ جدیدیت کے رجحان کی مقبولیت بھی بڑا سبب ہے۔ اگر قارئین جدید نظریۂ علم و ادب میں دل چسپی نہ لیتے تو شب خون کی اہمیت کسی ترجمے کی کتاب سے زیادہ نہ ہوتی۔ جدیدیت کی ترجمانی اور اس کی علمی سرپرستی خود فاروقی فرما رہے تھے اسی لیے فاروقی، جدیدیت اور شب خون سے ایسی دل چسپ تثلیث بن کر ابھری جس نے مختلف ناحیوں سے اردو ادب کو نیا رخ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ شب خون کے مشمولات (جن میں بیسویں صدی کے نصف آخر کے علمی، ادبی، تہذیبی اور سماجی رجحانات کی روح جھلکتی ہے) کے مطالعے سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ اس کا معیار مدیر کی اخلاقی جرأت اور انتخاب کے سنجیدہ رویے سے بنا ہے۔ شب خون نے ایک پوری نسل کی تربیت کی ہے، اسی وجہ سے وارث علوی نے کہا تھا کہ اگر شب خون نہ ہوتا تو میں شاید ادب میں آتا ہی نہیں، نقاد بنتا ہی نہیں [حوالہ: شب خون، شمارہ 293، ص 581]۔ بلاشبہ شب خون کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک عہد سے تعبیر کریں تو غلط نہ ہوگا۔

شب خون کے اوراق ظاہری اور باطنی دونوں سطح پر معنویت سے لبریز نظر آتے ہیں، سرورق کے بیرونی حصے پر چھپی تصاویر اور خاکے دراصل تجریدی آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں جو فنون لطیفہ کو فروغ دینے کی غرض سے مسلسل شائع کئے گئے۔ جب کہ شب خون نے سرورق کے اندرونی حصے پر اداریہ چھاپنے کی جو روایت قائم کی ہے وہ اردو دنیا میں بے مثال ہے۔ اردو رسائل میں پہلا ورق اداریے کے لیے مختص ہوتا ہے لیکن شب خون نے اداریہ نہ چھاپ کر کسی مغربی ادیب، ناقد یا فلسفی کی تحریر یا تحریر کا ایک ٹکڑا چھاپنے کی روایت قائم کی جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ چنانچہ شب خون کے تمام شماروں میں خالص علمی و ادبی نوعیت کے تمام اداریے (بہ استثنائے چند) مغربی ادیبوں، مفکروں اور دانشوروں کی تحریروں پر مبنی ہیں جنھیں ترجمہ کرکے چھاپا گیا ہے۔ ان متفرق اداریوں کا مزاج کسی نہ کسی طرح شعروادب کے عصری میلانات سے میل کھاتا ہے۔ شب خون کے سرورق پر چھپی یہ نادر تحریریں جہاں رسالے کے مزاج کا پتہ دیتی ہیں وہیں جدیدیت کے غالب رجحان اور اس کے تخلیقی رویوں کا تعارف بھی پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ ان تحریروں نے اردو شعروادب میں مغربی طرز فکر اور نئی تنقیدی سوچ کو جنم دیا ہے۔ ان تحریروں کی اہمیت بہرحال 'اداریے' کی ہے گرچہ اداریے کا عنوان نہیں ہے۔ غالب صدی، سید احتشام حسین، ن م راشد، زکی انور، اختر الایمان، علی سردار جعفری، خلیل الرحمن اعظمی، افتخار جالب، آل احمد سرور، عرفان صدیقی، جگن ناتھ آزاد، پرویز شاہدی کے وصال اور اندرا گاندھی کے قتل پر، قرۃ العین حیدر کو گیان پیٹھ انعام سے نوازا جانے پر یہ صفحہ ان حضرات کے نام مخصوص کیا گیا۔ مذکورہ مواقع کے علاوہ متذکرہ اداریہ تمام شماروں میں پابندی سے شائع ہوا۔ یعنی شب خون میں ایسے 276 اداریے موجود ہیں جو قاری کو علمی بصیرت اور ذہنی بالیدگی عطا کرتے ہیں۔

❒❖❒

Dr. Khushter Zarreen Malik
C-147, Second Floor
Opposite Shaheen Bagh Metro
Gate No. 5, Shaheen Bagh,
Okhla, Jamia Nagar
New Delhi-110025

پنکج کمار

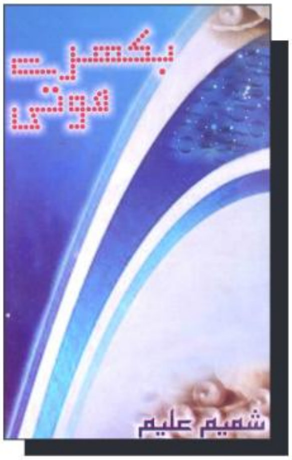

شمیم علیم کے انشائیوں 'بکھرے موتی' کا
فکری و فنی مطالعہ

شمیم علیم ایک ممتاز ماہرِ تعلیم اور مصنفہ ہیں، جنھوں نے اپنی علمی زندگی کا آغاز ناگپور یونیورسٹی سے سیاسیات اور پبلک ایڈمنسٹریشن میں ایم اے کرنے کے بعد کیا۔ ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا بڑا حصہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے وابستہ رہا، جہاں سے انھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور تدریس کے اعلیٰ مدارج طے کیے۔ اگرچہ ان کی مادری زبان اردو تھی، لیکن طویل عرصے تک انگریزی تعلیمی ماحول میں رہنے کی وجہ سے وہ اردو تحریر سے دور ہوگئی تھیں۔ تاہم، عابد علی خان صاحب اور اخبار 'سیاست' کے تعاون سے ان کا رشتہ دوبارہ اپنی مادری زبان سے جڑا اور وہ ایک صاحبِ طرز قلم کار کے طور پر ابھریں۔

ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز 1961 میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ہوا جہاں وہ بحیثیت لیکچرر مقرر ہوئیں؛ اسی دوران انھوں نے پی ایچ ڈی مکمل کی اور اپنی علمی قابلیت کی بنیاد پر 1984 میں پروفیسر کے عہدے پر ترقی پائی۔ انھوں نے یونیورسٹی میں صدر شعبہ، چیئرپرسن بورڈ آف اسٹڈیز اور اکیڈمک سینیٹ کی رکن جیسے کلیدی انتظامی و تعلیمی عہدوں پر خدمات انجام دیں اور 1990 میں عثمانیہ یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئیں۔

شمیم علیم کی ادبی خدمات کا آغاز اخبار 'سیاست' کے ذریعے ہوا، جہاں انھوں نے پہلے انگریزی میں مضامین لکھے جن کا ترجمہ شائع ہوتا تھا، لیکن بعد ازاں انھوں نے خود اردو میں لکھنا شروع کیا۔ ان کا پہلا اہم مضمون ''میں نے تمھیں طلاق دے دی'' تھا، جو امریکہ منتقلی کے بعد شائع ہوا۔ انھوں نے پانچ سال کے مختصر عرصے میں تقریباً 40 سے 45 مضامین لکھے، جن میں سماجی مسائل بالخصوص خواتین کی دوسری شادی اور خاندانی قربانیوں جیسے نازک موضوعات کو نئے زاویوں سے پیش کیا۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں ہیں جن میں 'جاگ عورت جاگ'، 'زندگی کبھی رکتی نہیں'، 'میرا پیغام محبت ہے'، 'ستاروں سے آگے'، 'بکھرے موتی'، 'سوندے مٹی کا عطر' ان فن پاروں سے انھوں نے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

شمیم علیم کا مجموعہ مضامین 'بکھرے موتی' اردو نثر میں ایک ایسی کہکشاں کی مانند ہے جہاں زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو بڑی فنکاری سے پرویا گیا ہے۔ اس کتاب کے عنوانات، جیسے 'مسائلِ زندگی'، 'گردشِ ایام' اور 'زیرِ لب'، اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ مصنفہ کا مشاہدہ کتنا گہرا اور فکر کتنی ہمہ گیر ہے۔ انھوں نے جہاں 'بیٹی'، 'تنہائی' اور 'عبادت' جیسے موضوعات کے ذریعے انسانی روح کے نہاں خانوں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے، وہی 'چار مینار کی آغوش میں' اور 'حیدرآبادی بریانی' جیسے عنوانات سے دکن کی تہذیبی خوشبو کو بھی زندہ رکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں معاشرتی ناہمواریوں پر طنز بھی ہے اور اصلاحِ معاشرہ کا درد بھی، جو قاری کو نہ صرف غور و

فکر کی دعوت دیتا ہے بلکہ جذباتی سطح پر بھی متاثر کرتا ہے۔ بالخصوص 'شمیم علیم سے ملیے' والا گوشہ ان کی ہمہ جہت شخصیت کے اعترافِ فن کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ مختصراً یہ کہ، یہ کتاب محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ بکھرے ہوئے ایسے قیمتی خیالات ہیں جو انسانی بصیرت کو جلا بخشتے ہیں۔

> **افسانے میں راؤ صاحب کا کردار اس استحصالی نظام کی علامت ہے جہاں طاقت اور پیسہ سح کو دبانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، جبکہ کریم خان کا کردار ایک فرض شناس افسر کی صورت میں امید کی ایک کرن بن کر ابھرتا ہے۔ اندھی بھکارن کے ذریعے کہانی کا کلائمکس جس جذباتی انداز میں سامنے آتا ہے، وہ قاری کے دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے؛**

اس کتاب 'بکھرے موتی' کی فہرست کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: مسائلِ زندگی، گردشِ ایام، بکھرے موتی، اور زیرِ لب۔ ان چاروں حصوں کے مرکزی خیال اور ان میں شامل اہم مضامین کے عنوانات کو مدِنظر رکھتے ہوئے، ان چار حصوں میں کتاب کے ایک حصے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کتاب کے ایک حصے کو موضوعِ تنقید بنایا ہے۔ جس کا عنوان 'مسائلِ زندگی' ہے۔ 'مسائلِ زندگی' کے تحت لکھے گئے یہ مضامین شمیم علیم کے گہرے سماجی شعور اور انسانی نفسیات کی باریکیوں سے واقفیت کا بین ثبوت ہیں۔ ان تحریروں میں معاشرتی تلخیوں کو محض بیان نہیں کیا گیا بلکہ ان کے پسِ پردہ محرکات کو بڑی دردمندی اور فنکارانہ چابکدستی سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ مصنفہ کا اسلوب سادہ مگر پر اثر ہے، جو قاری کو روزمرہ کے عام واقعات میں چھپے ہوئے گہرے فلسفیانہ اور اخلاقی پہلوؤں پر غور کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان مضامین میں طنز و مزاح کی دھیمی آنچ اور اصلاحِ معاشرہ کا جذبہ مل کر ایک ایسا ادبی نمونہ پیش کرتے ہیں جو فکر اور احساس دونوں کو جلا بخشتا ہے۔

افسانے میں راؤ صاحب کا کردار اس استحصالی نظام کی علامت ہے جہاں طاقت اور پیسہ سچ کو دبانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، جبکہ کریم خان کا کردار ایک فرض شناس افسر کی صورت میں امید کی ایک کرن بن کر ابھرتا ہے۔ اندھی بھکارن کے ذریعے کہانی کا کلائمکس جس جذباتی انداز میں سامنے آتا ہے، وہ قاری کے دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے؛ خاص طور پر اس کا یہ سوال کہ "اگر محبت کا انجام یہی ہے تو خدا نے یہ جذبہ پیدا ہی کیوں کیا؟" معاشرتی اقدار پر زوردار طنز ہے۔

انشائیہ 'بیٹی' اپنی بنت میں سادہ ہونے کے باوجود گہرے جذباتی تلاطم اور سماجی و نفسیاتی کشمکش کا آئینہ دار ہے۔ مصنفہ نے عصری معاشرت کے ایک اہم المیے یعنی کیریئر کی چکاچوند اور خونی رشتوں کے تقدس کے مابین انتخاب کو کمالِ مہارت سے موضوعِ بحث بنایا ہے۔ کہانی کا بیانیہ اس وقت ایک المیہ صورت اختیار کر لیتا ہے جب ایک ذہین اور باشعور بیٹی، اپنی ماں کی خدمت کے لیے اپنی محبت اور روشن مستقبل کی قربانی دے کر مٹی کی خوشبو اور اپنوں کے لمس کو ترجیح دیتی ہے۔

افسانہ 'چار دیواری آغوش میں' اپنی داخلی ساخت اور المیے کی فضا کے اعتبار سے ایک مؤثر سماجی بیانیہ ہے جس میں محبت، معاشی ناہمواری اور سماجی جبر کی تثلیث بڑی سادگی مگر شدت کے ساتھ ابھرتی ہے۔ ابتدائی جملہ ''آج بہت خوش نظر آ رہی ہو، کیا بات ہے؟'' بظاہر معمولی مکالمہ ہے، مگر اسی سادہ خوشی کے پس منظر میں ایک ایسا المیہ پوشیدہ ہے جو آخر کار قاری کو لرزا دیتا ہے۔ افسانہ نگار نے چار دیواری کو محض مکان کی علامت نہیں بلکہ گھٹن، خوابوں کی شکست اور تقدیر کی سنگینی کے استعارے کے طور پر برتا ہے؛ چنانچہ جب شیفہ کہتی ہے: ''ہم دو مکان ادھورے میں نہیں رہ سکتے'' تو یہ جملہ صرف رہائش کا مسئلہ نہیں بلکہ معاشرتی مرتبے اور عزتِ نفس کی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے برعکس حامد کا فقرہ ''میرے پاس اتنا

پیسہ نہیں'، معاشی بے بسی کا عکاس ہے جو محبت کو بھی بے دست و پا کر دیتی ہے۔ افسانے کا اختتام، جہاں چار دیواری ہی آغوشِ مزار بن جاتی ہے، علامتی سطح پر نہایت مؤثر ہے اور یہ تاثر دیتا ہے کہ سماج کی بے رحم ساخت فرد کے خوابوں کو نگل لیتی ہے۔

یہ افسانہ 'جینے مرنے کی آرزو میں' متوسط طبقے کی نفسیاتی کشمکش اور معاشی جبر کے پس منظر میں انسانی وقار، خودداری اور خاندانی محبت کی ایک دردناک مگر باوقار داستان پیش کرتا ہے۔

تنقیدی طور پر دیکھا جائے تو افسانہ جذباتیت کی سرحدوں کو

''شمیم علیم کا افسانہ 'بی خالہ سے گفتگو' دراصل ہمارے معاشرے کے اس دوغلے پن اور فرسودہ سماجی ڈھانچوں کا ایک نوحہ ہے جہاں روایت اور جدت کی کشمکش میں ہمیشہ انسانی جذبات اور نسائی خود مختاری کی قربانی دی جاتی ہے۔ اس افسانے کے آخر میں مصنفہ کا یہ سوال کہ 'عورت ہی عورت کا مسئلہ کیوں ہے؟' فکر و دانش کے نئے در وا کرتا ہے، جو اس افسانے کو محض ایک قصہ نہیں بلکہ ایک سماجی بیانیہ (Social Narrative) بنا دیتا ہے، جس میں جہیز، بے جوڑ شادیاں اور خواتین کے معاشی استحکام جیسے اہم موضوعات کو بڑی دردمندی اور فصاحت کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے''

سماج کے بدنما زخموں کو کریدنے کی کامیاب کوشش کرتی ہے۔ مصنف نے جس مہارت سے امجد خان، اکبر صدیقی اور رام پرشاد کے کرداروں کے ذریعے دولت کی ریل پیل کے باوجود ذہنی افلاس کو موضوع بنایا ہے، وہ عصرِ حاضر کے بگڑتے ہوئے خاندانی نظام کا نوحہ محسوس ہوتا ہے۔ افسانے کا اسلوبِ بیان سلیس مگر معنی خیز ہے، جہاں مکالموں کی چاشنی میں چھپی سماجی رقابتیں اور احساسِ کمتری کے شکار کردار واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

'جوتوں کا تاج محل' اپنے اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے بیانیہ نثر

چھوتا ضرور ہے، مگر مصنف نے اسے واعظانہ انداز سے بچا کر انسانی تجربے کی صداقت سے وابستہ رکھا ہے۔ اختتام میں بیٹی کے جملے کے ذریعے زندگی اور موت کے فلسفے کو جس سادگی سے سمویا گیا ہے، وہ پوری کہانی کو معنوی وسعت عطا کرتا ہے۔

اس کے بعد افسانہ 'گولی کی حرکت میں برکت' دراصل ایک تمثیلی اور سائنسی بیانیہ ہے، جو جدید ٹیکنالوجی کے ہاتھوں انسانی فطرت اور سماجی اقدار کے زوال پر گہرا طنز کرتا ہے۔ مصنف نے ایک ایسی فرضی گولی کا نقشہ کھینچا ہے جو بھوک تو مٹا دیتی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی زندگی کی رونق، محنت کا جذبہ اور انسانی رشتوں کی مٹھاس بھی چھین لیتی ہے۔

اس کے بعد افسانوی تحریر 'کاغذی پیرہن' معاشرتی نمائش، طبقۂ امرا کی اخلاقی کج روی اور اسراف و تبذیر کے مہیب ہوتے سائے کے گرد گھومتی ایک ایسی تلخ حقیقت ہے، جو طنز کی دھار سے

کا ایک ایسا مرقع ہے جہاں جذباتی احتجاج اور طنز کی کاٹ باہم دست و گریبان نظر آتی ہیں۔ شمیم علیم نے اس تحریر میں علامت نگاری کا سہارا لیتے ہوئے ایک سیاسی واقعے کو تاریخی تناظر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، جس کا آغاز تاج محل جیسی 'محبت کی نشانی' کے تذکرے سے ہوتا ہے لیکن متن کا رخ بہت جلد 'نفرت کی یادگار' کی جانب مڑ جاتا ہے۔ تحریر کا سب سے طاقتور پہلو وہ تضاد ہے جو ایک طرف 'سفید تاج محل' کی چاندنی اور دوسری طرف 'خون کی ندیوں' کے ہولناک منظر نامے کے درمیان تخلیق کیا گیا ہے، جو قاری کے شعور کو جھنجھوڑنے اور اسے عالمی بے حسی پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ پارۂ نثر ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ ایک گہرے سیاسی احتجاج کا استعارہ ہے، جس میں الفاظ کی نشتر زنی اور قلم کی کاٹ نے ایک تلخ حقیقت کو افسانوی رنگ دے کر تاریخ کے حافظے میں محفوظ کرنے کی سعی کی ہے۔

افسانہ 'عبادت' اپنی فکری ساخت اور موضوعاتی گہرائی کے اعتبار سے معاشرتی بے حسی اور مذہب کی ظاہری تعبیرات پر ایک گہرا طنز ہے، جسے مصنفہ نے کمالِ ہنرمندی سے ایک گھریلو المیے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ کہانی کا اسلوب سادہ مگر بیانیہ اس قدر پر تاثیر ہے کہ قاری مریم آپا کے کردار کی تنہائی اور ان کے بچوں کی 'مصنوعی مصروفیت' کے درمیان چھپی خلیج کو اپنی روح میں محسوس کرتا ہے۔ فنی سطح پر یہ افسانہ اس الم ناک تضاد کو بے نقاب کرتا ہے جہاں اولاد فرائضِ منصبی اور مذہبی رسومات کی ادائیگی کو تو 'عبادت' سمجھ لیتی ہے، مگر ایثار، رفاقت اور والدین کی نفسیاتی دلجوئی جیسے عظیم انسانی جذبوں کو ثانوی حیثیت دے کر فراموش کر دیتی ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے یہ تحریر اپنے متاثر کن اختتام اور گداز لہجے کی بدولت معاشرے کے ان بند ہوتے ہوئے دریچوں پر دستک دیتی ہے جہاں اب صرف رسمی عبادات باقی رہ گئی ہے اور حقیقی انسانی ہمدردی کا قحط پڑ چکا ہے۔

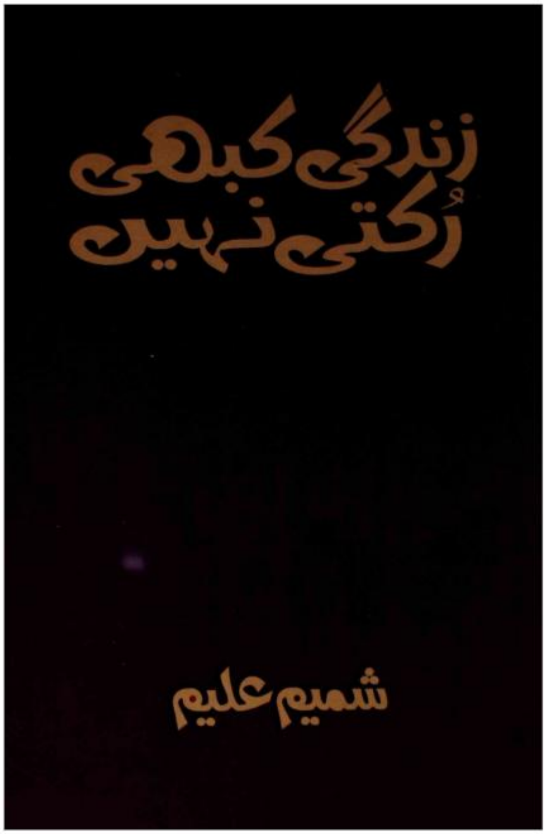

شمیم علیم کا افسانہ 'بی خالہ سے گفتگو' دراصل ہمارے معاشرے کے اس دوغلے پن اور فرسودہ سماجی ڈھانچوں کا ایک نوحہ ہے جہاں روایت اور جدت کی کشمکش میں ہمیشہ انسانی جذبات اور نسائی خود مختاری کی قربانی دی جاتی ہے۔ اس افسانے کے آخر میں مصنفہ کا یہ سوال کہ 'عورت ہی عورت کا مسئلہ کیوں ہے؟' فکر و دانش کے نئے در وا کرتا ہے، جو اس افسانے کو محض ایک قصہ نہیں بلکہ ایک سماجی بیانیہ (Social Narrative) بنا دیتا ہے، جس میں جہیز، بے جوڑ شادیاں اور خواتین کے معاشی استحکام جیسے اہم موضوعات کو بڑی دردمندی اور فصاحت کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے۔

زاہد علی خان (ایڈیٹر سیاست) کے نام لکھا گیا یہ مراسلہ محض ایک تحریر نہیں بلکہ معاشرتی بے حسی کے خلاف ایک پُر درد نوحہ اور اصلاحِ معاشرہ کی تڑپ سے لبریز ایک فکری دستاویز ہے، جس میں مصنف نے 'جہیز' جیسی قبیح رسم کو موجودہ دور کے تمام سماجی و اخلاقی بگاڑ کی جڑ قرار دیا ہے۔ ادبی لحاظ سے یہ تحریر سادگی اور اثر انگیزی کا حسین امتزاج ہے، جہاں جذبات کی صداقت نے الفاظ کو ایک خاص کاٹ عطا کر دی ہے؛ مصنف نے ایک طرف ہندوستان کی مادی ترقی اور عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے وقار کا ذکر کیا ہے تو دوسری طرف داخلی خلفشار، کرپشن اور اخلاقی پستی کے تضاد کو نہایت جرات مندی سے بے نقاب کیا ہے۔

مصنفہ کا اندازِ بیاں اگرچہ سادہ اور عام فہم ہے، مگر اس میں بلا کی تاثیر ہے جو قاری کو روزمرہ کے بظاہر معمولی واقعات میں پوشیدہ فلسفیانہ گہرائی اور اخلاقی پہلوؤں پر سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ان مضامین میں طنز و مزاح کی لطافت اور اصلاحِ معاشرہ کا جذبہ کچھ اس طرح یکجا ہو گیا ہے کہ یہ ایک ایسا ادبی شاہکار بن گئے ہیں جو فکر و احساس دونوں کو جلا بخشتے ہیں۔

Dr.Pankaj Kumar
Assistant professor, Guest Faculty
Department of Urdu
Kirori Mal College
Delhi University-110007
Mo.No.9063426590
mail:pankajurdu.kamal@gmail.com

سیدہ ایمن عبدالستار

بلقیس ظفیر الحسن

نسائی شعور اور تہذیب کی امین

ادب کی دنیا میں شاعری ہمیشہ سے ایک طاقتور اظہارِ بیان رہی ہے شاعری شعور کی اعلیٰ ترین سطح کا نام ہے۔ یہ فکر و فن کا وہ سنگم ہے جہاں شاعر اپنے مشاہدات کو وزن، آہنگ اور تخیل کی آمیزش سے ایک لافانی حقیقت میں بدل دیتا ہے۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جو بات نثر کی تخلیق نہیں کر سکی، وہ شاعری کے ایک مصرعے نے کر دکھائی۔ اردو ادب کی تاریخ میں بعض شعراء ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اردو زبان کو جلا بخشی اور معاشرے کو نیا شعور بھی دیا، بلقیس ظفیر الحسن صاحبہ بھی ایسی ہی ایک توانا آواز تھیں۔

اردو کی مابعد جدید شاعری میں جب فرد کی ذات اور اس کے داخلی کرب پر توجہ دی گئی، تو بلقیس صاحبہ کا نام ایک مستند حوالے کے طور پر ابھرا۔ ان کے ہاں 'ذات کا ادراک' کسی مصنوعی فلسفے کے بجائے زندگی کے تجربات سے کشید کیا گیا ہے۔ آپ کا مقام اردو ادب میں ایک ایسی 'خاموش معلمہ' کا ہے جس نے اپنے ضبط، سلیقے اور سچائی سے آنے والی نسلوں کو فن کی حرمت سکھائی۔ وہ جدید اردو نظم کے اس ستون کی مانند ہیں جس پر تہذیب اور تانیثیت کی خوبصورت چھت ٹکی ہوئی ہے۔

بلقیس پروین، شادی سے پہلے بلقیس بانو رحمانی کے نام سے لکھتی تھیں۔ دہلی میں مقیم رہیں۔ ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت تھیں۔ شاعری اور نثر کے علاوہ تراجم، ڈرامہ نگاری اور بچوں کے ادب سے بھی شغف رکھتی تھیں۔ دو شعری مجموعے 'گیلا ایندھن' اور 'شعلوں کے درمیان' منظر عام پر آ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ افسانوی مجموعے 'ویرانے آباد گھرانوں کے'، 'مانگے کی آگ' ترجمہ، ڈراموں کا مجموعہ 'تماشہ کرے کوئی' اور بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ 'دلچسپ' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی کتابوں پر ہندوستان کی اردو اکادمیوں سے کئی ایوارڈ مل چکے ہیں اور ان کے تصنیف کردہ ڈرامے دہلی میں کئی جگہ اسٹیج کیے جا چکے ہیں۔ ان کی تخلیقات سماجی سروکار اور تانیثیت سے معمور ہیں۔ ان کی کئی نظموں کے ہندی اور انگریزی تراجم کئی اہم انتھالوجیز میں شامل ہیں۔ آپ نے اردو نظم اور نثر دونوں میں اپنا لوہا منوایا۔ انھیں ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد اعزازات سے نوازا گیا۔

اگرچہ ان کی کتابوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، لیکن معیار کے اعتبار سے ان کا کام بہت بلند ہے۔ انھوں نے ثابت کیا کہ 'زیادہ لکھنے سے بہتر ہے کہ اچھا لکھا جائے'۔ ان کی کتابیں آج بھی ادبی ذوق رکھنے والوں اور خاص طور پر نسائی ادب پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی زندگی کے نشیب و فراز کی عکاسی کرتی ہیں۔

ان کا سب سے بڑا موضوع وہ عورت ہے جو گھر کی چار دیواری میں اپنی ذات کو اپنوں کے لیے قربان کر دیتی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں بدلتے ہوئے انسانی رویوں، رشتوں کی پامالی اور قدیم اقتدار کے ختم ہونے پر افسوس کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کے لیے ماضی ایک خوبصورت یاد کی طرح موجود ہے، جبکہ حال کی مادیت پرستی انھیں بے چین کرتی ہے۔ وہ گھر تک محدود نہیں رہیں، ان کی نظر معاشرے

کے بگڑتے ہوئے حالات پر بھی باریکی سے ٹکی تھی۔ان کے دوسرے مجموعے 'شعلوں کے درمیان' میں سماجی ناانصافی، شہروں کے جلنے اور انسانیت کے سسکنے کا کرب نمایاں ہے۔وہ نئی نسل اور پرانی نسل کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلوں پر بہت اثر انگیز بات کی ہیں اور ان کی شاعری میں ایک ماں کے جذبات بہت گہرے ہیں۔بچوں کی فکر، ان کی تربیت اور ان کے مستقبل سے جڑے خدشات ان کی نظموں میں جابجا ملتے ہیں۔وہ رشتوں کے تقدس کی قائل رہیں لیکن ان رشتوں میں ہونے والی ناانصافیوں کو بھی بیان کرتی ہیں۔انھوں نے غزل کے مقابلے میں نظم کو اپنی حساسیت کے اظہار کے لیے زیادہ موزوں پایا۔ ان کے مجموعہ کلام کے نام 'گیلا ایندھن'، 'شعلوں کے درمیان' ہیں۔ان کی نظم 'یسرلی امری' ان کے پہلے مجموعہ کلام 'گیلا ایندھن' کی ایک نہایت اثر انگیز اور روحانی نظم ہے۔اس کا عنوان قرآن پاک کی سورہ طٰہٰ کی آیت (رب اشرح لی صدری ویسر لی امری) سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے:

''اے میرے رب! میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے۔''

'یسّر لی امری' ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔یہ نظم ثابت کرتی ہے کہ وہ ایک ایسی ترقی پسند سوچ رکھنے والی خاتون ہیں جن کی جڑیں اپنی تہذیب اور مذہب میں پیوست تھیں۔

بلقیس نے پرانے عہد کے قصے کو موجودہ دور کے سماجی و نفسیاتی استحصال پر اس طرح لاگو کیا ہے کہ نظم میں ایک گہرا علامتی حسن پیدا ہو گیا ہے:

سحر پرداز کارخانے اور صف بہ صف سامری:

"سحر پرداز کارخانوں کا اک جال پھیلا ہوا، / صف بہ صف سامری، / رسیاں ۔۔۔ اژدھے بن گئیں"

یہاں 'سحر پرداز کارخانے' اور 'سامری' دراصل اس جدید مادی دنیا، سرمایہ دارانہ نظام اور جھوٹے پروپیگنڈوں کی علامت ہیں جو انسان کی آنکھوں پر فریب کا جادو کر دیتے ہیں۔جہاں سچائی کو چھپا کر رسیوں کو اژدھے بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور فرد کو خوفزدہ کیا جاتا ہے۔

'داکی ٹاکی' یہ نظم ان کے روایتی سنجیدہ اور فلسفیانہ انداز سے ہٹ کر ایک بے حد شگفتہ، معصوم اور خوبصورت تخلیقی رنگ کو پیش کرتی ہے۔

یہ نظم دادی اور پوتی کے خوبصورت رشتے کے گرد گھومتی ہے، جو مشرقی خاندانی نظام کی روح رواں ہے۔ایک طرف دادی ہیں جن کے مزاج میں عمر کا ٹھہراؤ، تجربہ، اور فکرمندی ہے، اور دوسری طرف پوتی ہے جو بچپن کی شوخی، چنچل پن اور توانائی کا مجسمہ ہے۔شاعرہ نے ان دو نسلوں کے ملاپ کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ان کا مخصوص شائستہ لہجہ یہاں ایک شفیق بزرگ کے روپ میں سامنے آتا ہے، نظم کی زبان بے حد سادہ، عام فہم اور بچوں کے ترانے جیسی رواں ہے۔

> شاعرہ کی ایل اور نظم 'نئی عورت کا ترانہ' نسائی شعور، فکری آزادی اور سماجی مصلحتوں کے خلاف ایل باوقار بغاوت کا بے حد طاقتور اور شاہکار نمونہ ہے۔یہ نظم روایتی نعرہ بازی سے پال ہے، لیکن اس کی گہرائی سماج کی صدیوں پرانی جکڑنوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔اس کا آغاز ہی ایل گہرے نفسیاتی اور سیاسی سچ سے ہوتا ہے

شاعرہ کی ایک اور نظم 'نئی عورت کا ترانہ' نسائی شعور، فکری آزادی اور سماجی مصلحتوں کے خلاف ایک باوقار بغاوت کا بے حد طاقتور اور شاہکار نمونہ ہے۔یہ نظم روایتی نعرہ بازی سے پاک ہے، لیکن اس کی گہرائی سماج کی صدیوں پرانی جکڑنوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔اس کا آغاز ہی ایک گہرے نفسیاتی اور سیاسی سچ سے ہوتا ہے۔شاعرہ کہتی ہیں کہ بیرونی طور پر مصلحتوں یا پابندیوں کی 'کنڈی' تو ہٹادی گئی ہے، لیکن آزادی کا سفر خود چل کر ہی طے کرنا ہوگا۔

'آزاد تو دماغ کو ہونا ہے
صرف جسم کی آزادی کوئی معنی نہیں رکھتی'

یہاں وہ واضح کرتی ہیں کہ حقیقی آزادی صرف قوانین کے بدلنے یا بیڑیوں کے کھلنے سے نہیں ملتی ہے جب تک انسان ذہنی طور پر خود کو آزاد تسلیم نہ کرے، وہ غلام ہی رہتا ہے۔

شاعرہ کی عظمت اس بات میں پنہاں ہے کہ انھوں نے اردو

شاعری کو خوابنا کی اور ماورائی تصورات کے بجائے ایک جیتی جاگتی زندگی کے کرب سے آشنا کیا۔ ان کی شاعری ان سلگتے ہوئے جذبے کی داستان ہے جو سماجی مصلحتوں کی وجہ سے کبھی شعلہ تو نہ بن سکا، لیکن اپنی تپش سے انسانیت کے ضمیر کو گرماتا رہا۔ ان کی عظمت کا اعتراف بڑے نقادوں نے بھی کیا ہے کہ وہ اردو کی ان معدودے چند شاعرات میں سے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں نسوانی احساس کو ایک نئی فکری بلندی اور وسعت عطا کی۔

ان کی شاعری آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا تہذیبی آئینہ ہے جن کے کلام میں معاشرتی بے حسی، اجتماعی تنہائی اور انسان کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کی سچی عکاسی ملتی ہے۔ انھوں نے جہاں اپنی شاعری کے ذریعے نسائی شعور کو زبان دی، وہیں ڈراموں کے ان مجموعے کے ذریعے انھوں نے انسانی نفسیات اور خاندانی نظام کے پوشیدہ زخموں کو اسٹیج کے پیراہن میں انتہائی خوبصورتی سے بے نقاب کیا ہے۔ یہ کتاب جدید اردو تھیٹر کے طالب علموں اور ناقدین کے لیے ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔ ڈراما 'شیشے کے کھلونے' بلقیس ظفیر الحسن کے مجموعے 'تماشہ کرے کوئی' کا ایک کلیدی ڈراما ہے۔ یہ ڈراما شہرہ آفاق امریکی ڈراما نویس ٹینیسی ولیم (Tennessee Williams) کے شاہکار ڈرامے 'گلاس مناجری' (The Glass Menagerie) سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے، جسے دہلی اردو اکیڈمی کے بارہویں ڈراما فیسٹول میں منتخب کر کے 'سری رام سینٹر دہلی' کے اسٹیج پر نغمہ ظفیر کی ہدایت کاری میں پیش بھی کیا جا چکا ہے۔

یہ ڈراما اس مجموعے کا شاہکار اور ایک شاندار ڈراما المیہ ہے۔ امریکی ڈراما نویس ٹینیسی ولیم کے عالمی شہرت یافتہ ڈرامے 'دی گلاس مناجری' سے متاثر ہونے کے باوجود، بلقیس صاحبہ نے اس کی روح کو خالصتاً ہندوستانی مسلم معاشرے کے زوال پذیر جاگیردارانہ پس منظر میں ایسے پرو دیا ہے کہ یہ کہیں سے بھی مستعار یا اجنبی نہیں لگتا۔

کہانی چار بنیادی کرداروں کے گرد گھومتی ہے:

نفیسہ (ماں): ڈھلتی عمر کی ایک ایسی خاتون جو ماضی کے جاگیردارانہ اور برطانوی ملٹری کلاس کے ٹھاٹھ باٹھ میں جی رہی ہے، اور ہر وقت سمارٹ اور فیشنیبل نظر آنے کی کوشش کرتی ہے۔

لبنیٰ (بیٹی): نفیسہ کی بیٹی، جس کا چہرہ غمزدہ، شرمیلا اور ڈرا ڈرا سا ہے۔ وہ حد درجہ حساس اور احساسِ کمتری کا شکار ہے۔

اعجاز (بیٹا): نفیسہ کا بیٹا، جو خود کو انٹلیکچوئل دکھانے کی کوششوں میں مگن ہے (جو کہ دراصل افسانہ نگار اور رائٹر ہے)۔

امجد: اعجاز کا دوست، جو ایک حقیقت پسند، سلجھے ہوئے نوجوان کے روپ میں سامنے آتا ہے۔

اردو ادب میں ترجمہ نگاری کو عموماً ایک ثانوی درجے کا کام سمجھا جاتا ہے، مگر بلقیس صاحبہ نے اپنے اعلیٰ ادبی ذوق، فکری گہرائی اور فنی مہارت سے یہ ثابت کیا کہ ترجمہ الفاظ کا ہیر پھیر نہیں ہے بلکہ خود ایک اعلیٰ درجے کا تخلیقی عمل ہے۔ ماہرینِ لسانیات کا ماننا ہے کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ اصل تخلیق کار یا مصنف کے ساتھ ناانصافی ہوتا ہے۔ ایک بہترین ترجمہ وہ ہوتا ہے جو اصل متن کی صرف ظاہری زبان کے ساتھ اس کے اندر چھپی ہوئی کیفیت، احساس، اور اس کی روح کو دوسری زبان کے مزاج اور دیسی ماحول کے مطابق ایک نیا تخلیقی پیراہن عطا کرے۔ ترجمہ نگاری خود ایک اعلیٰ درجے کا تخلیقی عمل ہے، جہاں مترجم کو دونوں زبانوں کی گرامر، محاوروں، روزمرہ اور ان سے جڑی تہذیبوں پر مکمل گرفت ہونی چاہیے تاکہ وہ اصل مصنف کے فکری شعلوں کو اپنی زبان کے دالان میں دیانت داری سے روشن کر سکے۔

ان کے ترجموں کا مجموعہ 'مانگے کی آگ' اردو ادب کا ایک انتہائی اہم اور منفرد کتاب ہے۔ یہ کتاب ہمیں عالمی ادب کے مایہ ناز افسانوں اور ڈراموں کے اعلیٰ ترین فکری گوشوں سے متعارف کراتی ہے۔

فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بلقیس صاحبہ نے عالمی ادب کے بہترین نگینوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ انھوں نے انگریزی، روسی، اور بنگالی ادب کے لافانی تخلیق کاروں کا انتخاب کیا ہے۔ مصنفہ نے اپنے پیش لفظ میں فنِ ترجمہ نگاری پر انتہائی عمیق اور عالمانہ بحث کی ہے۔

'مانگے کی آگ' دوسری زبانوں کی کہانیوں کا چربہ ہونے کے ساتھ یہ آپ کے اعلیٰ ادبی ذوق اور عالمی شعور کا نچوڑ ہے۔ انھوں نے

عالمی ادب کے ان پوشیدہ شعلوں کو اردو زبان کا پیراہن دے کر مقامی قارئین کے شعور کو گرما دیا ہے۔ مصنفہ نے دوسری زبانوں سے جو 'آگ' مانگی، اس سے انھوں نے اردو ادب کے دالان کو اِنتہائی خوبصورتی اور دیانت داری سے روشن کیا ہے۔

بلقیس صاحبہ کا نام جدید اردو افسانے کے منظر نامے پر ایک ایسا معتبر اور منفرد نام ہیں جنھوں نے روایتی مروجہ اسلوب سے ہٹ کر انسانی رشتوں کی نفسیات اور سماجی رخنوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ ان کی افسانہ نگاری حقیقت پسندی، نسائی شعور اور گہری فکری دیانت داری کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ ان کے افسانوں کا سب سے بڑا تانا بانا خاندانی نظام، رشتوں کے بکھراؤ اور گھریلو چار دیواری کے اندر پلنے والے کرب کے گرد گھومتا ہے۔ وہ معاشرتی منافقت، مادی ہوس، اور جدید دور میں بدلتے ہوئے انسانی رویوں کو اِنتہائی باریک بینی سے پکڑتی ہیں۔ ان کی کہانیاں یہ درشاتی ہیں کہ کس طرح مادی مفادات کے سامنے رشتوں کا تقدس پامال ہو جاتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری اردو ادب میں اس لیے منفرد ہے کیونکہ وہ زندگی کے تلخ ترین سچ کو اِنتہائی سادگی اور چابکدستی سے افسانے کے قالب میں ڈھال دیتی ہیں۔

بلقیس ظفیر الحسن کے افسانوی مجموعے 'ویرانے آباد گھرانوں کے' میں شامل ایک اِنتہائی فکر انگیز اور لرزہ خیز افسانہ "گرین کارڈ" ہے، یہ افسانہ ہجرت، مادی ہوس، خاندانی رشتوں کے بکھراؤ اور مغرب میں بسنے والے ایشیائی خاندانوں کے نفسیاتی و سماجی کرب کا ایک مکمل اور مدلل نوحہ ہے

بلقیس ظفیر الحسن کے افسانوی مجموعے 'ویرانے آباد گھرانوں کے' میں شامل ایک اِنتہائی فکر انگیز اور لرزہ خیز افسانہ "گرین کارڈ" ہے، یہ افسانہ ہجرت، مادی ہوس، خاندانی رشتوں کے بکھراؤ اور مغرب میں بسنے والے ایشیائی خاندانوں کے نفسیاتی و سماجی کرب کا ایک مکمل اور مدلل نوحہ ہے۔

اردو ادب کی یہ درخشندہ شمع 13 دسمبر 2011ء کو دہلی میں گل ہوگئی، مگر ان کی تحریریں آج بھی نئی نسل کی خواتین کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ آپ کی شاعری ادب کی تہذیب کا احوالِ حقیقی ہے۔ آپ نے ثابت کیا کہ ایک عورت اپنے گھر کی چار دیواری میں رہ کر بھی کائنات کے وسیع حقائق کو اپنے تخیل میں سمو سکتی ہے۔ اپ کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا۔

ایک ادیبہ ہونے کے ساتھ اپنے عہد کی خاموش معلمہ تھیں جنھوں نے اپنے ضبط، سلیقے اور سچائی سے فن کی حرمت کا پاس رکھنا سکھایا۔ ان کی تخلیقی کائنات، چاہے وہ شاعری کی دنیا ہو یا افسانے کی حقیقت پسندی، یا ڈرامے کا استعاراتی حسن، انسانیت کے ضمیر کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ انھوں نے اپنے فن کا کبھی سودا نہیں کیا اور نہ اپنے وقار پر کبھی آنچ آنے دی یہی وجہ ہے کہ ان کی ادبی و تہذیبی وراثت آج بھی نئی نسل کے مصنفین کے لیے ایک روشن مشعلِ راہ ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بلقیس صاحبہ نے اردو ادب کے دالان کو دوسری زبانوں کے تراجم کی مانگی کی آگ سے بھی روشن کیا اور اپنی تخلیقات کے سلگتے ہوئے جذبوں سے چمکایا۔ وہ دیسی مٹی اور ایمان کی جڑوں سے جڑی ایک ایسی منفرد تخلیق کار تھیں جن کی نظر مادی دنیا کے سامری جادو کو اِنتہائی چابکدستی سے بے نقاب کرتی تھی۔ وہ رخصت ہو کر بھی اپنے لافانی، منفرد لفظوں کی صورت میں ہمارے درمیان موجود ہیں، اور رشتوں کے تقدس اور نسائی شعور کا یہ باوقار ترانہ اردو ادب کے افق پر ہمیشہ گونجتا رہے گا۔

❑❖❑

Syeda Aiman Abdus Sattar
D/o Dr. Farooqui Mujeeb Majeed
Flat No 1, Alhayat Apartment
Riyaz Colony, Take Nager
Ambajogai Road Latur
Latur- 413512 (M.S)

شاہدہ کوثر

اردو صحافت پر ڈیجیٹل میڈیا کے اثرات

اکیسویں صدی میں انسانی تہذیب کی سب سے بڑی دین ڈیجیٹل میڈیا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ میڈیا اسی صدی کی ایجاد ہو بلکہ بیسویں صدی کے اواخر میں ہی انسان نے اسے تلاش کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی لیکن اکیسویں صدی کے شروعاتی دور میں اس نے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ انقلاب جب بھی آتا ہے تو اپنے ساتھ کہیں تہذیبی، سماجی اور تمدنی تبدیلیاں لاتا ہے۔ میڈیا بھی اسی صدی کی سب سے کامیاب تبدیلی تھی۔ اسی انقلاب نے ذرائع ترسیل کی حدیں وسیع کر دی۔ شروعاتی دور میں انسان کو اپنے خیالات وجذبات کی

رسائی کے لیے صدیوں کا عرصہ درکار تھا لیکن اب پلوں میں اس تک ہر نئی دریافت پہنچ جاتی ہے۔ لہذا اب طرح طرح کی ٹکنالوجی اور سافٹ ویئر نے ہر کام کو اشارے پر رکھ دیا ہے یعنی ادھر کلک کیا اور وہاں کام ہو گیا اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ ڈیجیٹل میڈیا کی مدد سے ہر فرد صبح وشام اپنی تقدیر بدل رہا ہے۔ اسی ڈیجیٹل دنیا کے بطن سے عصر حاضر کی وہ تہذیب جنم لیتی ہے جسے ہم مشینی دور کی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔

روز بروز کہیں ایسے آلات دنیا میں وقوع پذیر ہو رہے ہیں جنہیں دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آج کے ڈیجیٹل میڈیا نے اپنی حیرت انگیز ترقی کی وجہ سے دنیا کو (Globle Village) عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ جدید میڈیا نے فاصلوں اور دوریوں کو ختم کر کے زندگی کے ہر شعبے میں نئی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ آج ہم جس سماج میں زندگی بسر کر رہے ہیں اسے مکمل طور پر ڈیجیٹل سماج بنانے میں جدید ترسیل وابلاغ کا اہم رول ہے۔ جدید میڈیا نے جہاں ایک طرف اخلاقیات، سماجیات، معاشیات، ادب و ثقافت اور زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی ہے وہی اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ صحافت کی ترویج وترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی زندگی کے ہر طبقے میں میڈیا مفید ہے اور فوائد کی طویل فہرست ہے لیکن جہاں تک اردو اخبارات کی اشاعت میں ڈیجیٹل میڈیا کے رول کی بات ہے تو یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو صحافت بھی جدید میڈیا پر اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید فضل حسین پرویز رقم طراز ہیں۔

موجودہ صدی میں ڈیجیٹل میڈیا اور ذرائع ترسیل کا کنٹرول ہے۔ روزمرہ ہونے والے واقعات وحادثات کی اطلاع لمحوں میں پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے چونکہ آج ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور ڈیجیٹل صحافت کا دور ہے لہذا دنیا بھر کے مواصلات انگلی کی ایک جنبش کی مرہوم منت ہو گئے ہیں۔

ترسیل و ابلاغ زندگی کا وہ شعبہ ہے جسے چند لمحے کے لیے اگر مکمل طور پر روک دیا جائے تو زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ ہماری معاشی ،سماجی، ثقافتی اور تہذیبی زندگی پر پوری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ آج زندگی جس تیز رفتاری سے ترقی کر رہی ہے صحافت کی ترقی اس سے کہیں زیادہ ہے اور یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنے والا دور اردو صحافت کے لیے روشن اور تابندہ دور ہوگا۔

ترسیل وابلاغ زندگی کا وہ شعبہ ہے جسے چند لمحے کے لیے اگر مکمل طور پر روک دیا جائے تو زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ ہماری معاشی ،سماجی، ثقافتی اور تہذیبی زندگی پر پوری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ آج زندگی جس تیز رفتاری سے ترقی کر رہی ہے صحافت کی ترقی اس سے کہیں زیادہ ہے اور یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنے والا دور اردو صحافت کے لیے روشن اور تابندہ دور ہوگا۔

ڈاکٹر احسان عالم اپنے ایک مضمون میں جدید میڈیا اور اردو صحافت کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> ''اکیسویں صدی کی آمد کے ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کافی ترقی ہوئی ،ان ترقیوں کے ساتھ اردو صحافت کے آنگن میں نئی روشنی آب و تاب کے ساتھ نظر آئی۔اردو اخبارات ،رسائل و جرائد کی اشاعت اور طباعت کا مرحلہ آسان سے آسان تر ہوتا چلا گیا۔دنیا آج گلوبل ولیج میں تبدیل ہو چکی ہے اور اس کے ساتھ ہی اردو صحافت کی ساخت پر لگام لگانا آسان ہوتا گیا۔کمپیوٹر کی آمد اور انٹرنیٹ کے پھیلاؤ کے ساتھ اردو صحافت کا دائرہ کافی تیزی سے وسیع ہوتا گیا، اکیسویں صدی کی شروعات کے ساتھ ہی اردو اخبارات کی ظاہری شکل وصورت اور خوبصورتی میں کافی اضافہ ہو گیا جو عام قارئین کی توجہ کا مرکز بنا دہلی ،اتر پردیش، بہار، جموں وکشمیر، جھارکھنڈ، مدھیہ پردیش اور مغربی بنگال وغیرہ صبح میں اردو صحافت نے کافی ترقی کی۔''

(حوالہ: امام اعظم، اکیسویں صدی میں اردو صحافت ص 141)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہے کہ آج ہم جس دور میں جی رہے ہیں وہ مکمل طور پر ڈیجیٹل میڈیا کا دور ہے۔ انسان نے زمینی سطح پر جتنی سرحدیں قائم کی ہیں صحافت نے ان سرحدوں کو توڑنے پر مجبور کر دیا ہے اور تغیر ایسے ہی نہیں وجود میں آیا اس کے لیے انسانی ذہن کے اندر موجود دیواریں عبور کرنے کا طریقہ بھی آدمی نے میڈیا سے ہی سیکھا ہے اور اس عبوری عمل کی وجہ سے صحافت نے نہ صرف اجتماعی اور انفرادی زندگی کو اثر انداز کیا بلکہ انسانی علوم پر بھی اس کے اثرات مرتب ہیں۔

ڈیجیٹل میڈیا کے مثبت اثرات کی وجہ سے اردو صحافت متواتر ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ چونکہ ڈیجیٹل میڈیا ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس نے اردو صحافت کی دنیا تک ان شیدائیوں کی بھی رسائی کرائی ہے جو محبان اردو تو تھے لیکن ان کو اردو پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ لہٰذا موجودہ دور میں مغربی ممالک سے بھی کئی اردو اخبارات شائع ہو رہے ہیں جو نہ صرف اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں اضافہ کر رہے ہیں بلکہ شاعری اور ادب کی ہر عام و خاص تک رسائی کر رہے ہیں۔ آج جدید میڈیا اور ویب سائٹس کی مدد سے اردو صحافت میں نئے باب کا آغاز ہوا ہے۔سوشل میڈیا پر ایسی کئی ویب سائٹس موجود ہیں جو اخبارات کے علاوہ سماجی اصلاح میں بھی اہم رول ادا کر رہی ہیں یہ اردو زبان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے ذریعے بھی دنیا بھر میں صحافت کی ترسیل ہو رہی ہے۔ دور درشن پر چلنے والے نیوز چینل، ڈی ڈی اردو، ای ٹی وی اردو اور TV4 وغیرہ گزشتہ کئی عرصے سے اردو صحافت کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ دور درشن سے اردو پروگراموں کے علاوہ خبریں، انٹرویوز اور مباحثے وغیرہ کے لیے اردو زبان و ادب سے وابستہ معتبر شخصیت کی خدمات سے روز بروز استفادہ کیا جا رہا ہے۔

جدید میڈیا اور اردو زبان کے حوالے سے تنزیل اطہر لکھتے ہیں۔

''اردو کا الیکٹرانک میڈیا سے گہرا رشتہ ہے چونکہ الیکٹرانک میڈیا کے مخاطب عوام ہیں اور عوام کے درمیان جو زبان لنگوافرنکا کے طور پر رائج ہے وہ اردو ہے اس لیے الیکٹرانک میڈیا خواہ وہ ریڈیو کی نشریات ہوں یا ٹیلی ویژن کی ہر میدان میں اس نے اردو سے خوب فائدہ اٹھایا ہے''

(حوالہ: تنزیل اطہر، الیکٹرانک میڈیا اور اردو صحافت ص 225)

ایک زمانہ تھا جب اردو اخبارات بیرون ممالک کو بھیجے جاتے تو کم از کم ایک ہفتے یا تین دن کا وقت درکار ہوتا تھا لیکن ڈیجیٹل میڈیا کی بدولت جہاں سے اخبار شائع ہوتا ہے وہاں کے قارئین کے ہاتھ میں پہنچنے سے پہلے ہی سوشل میڈیا کے ذریعے نہ صرف پورے ملک بلکہ بیرون ممالک بھی پہنچ جاتا ہے

مندرجہ زیل اقتباس سے یہ واضح ہے کہ جدید ٹکنالوجی کے استعمال کے معاملے میں اردو زبان کسی بھی زبان سے کم نہیں اور نہ ہی خبروں کے معاملے میں اردو اخبارات پیچھے ہیں۔ اردو کے اخبارات میں بین الاقوامی خبروں کو خاص طور پر اہمیت دی جاتی ہے۔ اردو ان پیج نے نوری نستعلیق کی مدد سے اردو اخبارات کی طباعت میں انقلاب برپا کر دیا ہے اور بیشتر اور دو اخبارات نے ویب سائٹس پر انگریزی ایڈیشن بھی جاری کر دیے ہیں۔ جس کی وجہ سے غیر اردو داں طبقہ بھی ان اخبارات سے استفادہ کر رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اردو اخبارات بیرون ممالک کو بھیجے جاتے تو کم از کم ایک ہفتے یا تین دن کا وقت درکار ہوتا تھا لیکن ڈیجیٹل میڈیا کی بدولت جہاں سے اخبار شائع ہوتا ہے وہاں کے قارئین کے ہاتھ میں پہنچنے سے پہلے ہی سوشل میڈیا کے ذریعے نہ صرف پورے ملک بلکہ بیرون ممالک بھی پہنچ جاتا ہے۔

ماہرین کے مطابق جدید ٹیکنالوجی اردو صحافت کو فروغ دینے کا باعث بن رہی ہے۔ روس، برطانیہ، امریکہ، چین، اور جرمنی سمیت کئی ممالک نے خبروں کی ترسیل کے لیے اردو سروس شروع کر دی ہیں۔ ناروے، سویڈن، کناڈا سمیت دنیا کے کئی ملکوں میں خبروں کی فراہمی کے لیے مختلف اردو ویب سائٹس کا استعمال کیا جا رہا ہے اگر صرف ریختہ ڈاٹ کام کی بات کی جائے تو اردو کی سینکڑوں ایسی کتابیں اس ویب سائٹس پر موجود ہیں جس سے اردو دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ پہلے لوگ ہندوستان کا اردو اخبار دیگر ممالک میں اور دیگر ممالک کا اردو اخبار ہندستان میں نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ڈاک کے ذریعے اگر اخبارات ورسائل منگوائے بھی جاتے تھے تو خبریں اور مضامین باسی ہو جاتے تھے، لیکن آج جدید ٹکنالوجی اور انٹرنیٹ کے ذریعے کناڈا، امریکہ، برطانیہ میں بیٹھا شخص ایک بٹن دبا کر ہندوستان کے اردو اخبارات وجرائد، میگزین اور دیگر ویب سائٹس کی ورق گردانی کر سکتا ہے جس کی وجہ سے اردو زبان پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا دونوں ذرائع سے بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے اور دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں اپنا نمایاں مقام بنا رہی ہے۔ اردو کے معروف صحافی سہیل انجم اپنی کتاب 'میڈیا، اردو اور جدید رجحانات' میں لکھتے ہیں:

''آج اردو کے صحافیوں میں جدید ٹکنالوجی سے استفادہ کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اور اردو اخبارات کے دفاتر میں جدید ٹکنالوجیز اور وسائل سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ دہلی میں ایسے کئی اخبارات ہیں جو بیرون ملک کے پریس کی جانب اپنی کھڑکی کھولے ہوئے ہیں اور وہ اس پر نظر رکھتے ہیں کہ ان اخباروں میں کیا شائع ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے قارئین کی پسند کا لحاظ کرتے ہوئے بہت سی چیزیں لے کر شائع کر دیتے ہیں۔''

(حوالہ: سہیل انجم، میڈیا، اردو اور جدید رجحانات، ص101)

مندرجہ بالا قول سے یہ واضح ہے کہ جدید ٹکنالوجی کا اردو صحافت پر ہمیشہ سے ہی گہرا اثر رہا ہے۔ دیگر چیزوں کے ساتھ انفار

میشن ٹکنالوجیز اور ڈیجیٹل کمیونیکیشین نے صحافت کے میدان میں کئی تبدیلیاں لائی ہیں ۔ ان تبدیلیوں نے خبروں کے ڈیزائن اور تقسیم کے علاوہ قارئین کی خبروں تک رسائی میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی کہ ڈیجیٹل میڈیا نے روایتی میڈیا کے بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جن نیوز چینلز یا اخبارات نے خو کو ڈیجیٹل نہیں کیا وہ یا تو اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں یا پھر بند ہو گئے ہیں ۔

الغرض یہ کہا جا سکتا ہے جدید ٹکنالوجیز اور وسائل نے اردو صحافت پر ہر اعتبار سے دیرپا نقوش واثرات مرتب کیے ہیں اور اردو صحافت کو نئی سمتوں اور تغیرات سے آشنا کیا ہے۔ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیب ہے جو اپنے اندر کئی کہیں ادوار سمیٹے ہوئے ہیں لہٰذا بدلتے دور کے ساتھ غالباً اس بات کو قبول کر لینا کہ زبان میں بھی تبدیلیاں وقوع پزیر ہوں گی کسی حد تک مناسب ہے۔ اگر چہ زندہ زبان دیگر زبانوں کو اپنے دامن میں سمونے کا ہنر رکھتی ہے لیکن دور حاضر کی صحافتی زبان اس اردو کی نمائندگی نہیں کرتی جو کبھی مولوی محمد باقر، مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کے اخبارات کی زینت ہوا کرتی تھی ۔ میں اس بات سے قطعی روگردانی نہیں کرتی کہ وقت کے ساتھ تبدیلیوں کو قبول کر لینا اشد ضروری عمل ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ زبان کی اصل کو برقرار رکھنا بھی ضروری ہے لہٰذا اردو صحافیوں کو اس کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے ۔ چونکہ اردو زبان کے حوالے سے جو کام اب تک ہوا ہے یا جو کچھ ڈیجیٹل میڈیا پر دستیاب ہے وہ تشفی بخش ضرور ہے مگر اس میں ابھی گنجائش باقی ہے ۔

کتابیات

1 اکیسویں صدی میں اردو صحافت، امام اعظم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نہیں دہلی، 2016

2 الیکٹرانک میڈیا اور اردو صحافت، تنزیل اطہر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2015

3 میڈیا، اردو اور جدید رجحانات، سہیل انجم، یجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2010

❐❖❐

Ms. Shahida Kosser
Research Scholar
Department Urdu
BGSB University
Rajouri-185234 (J&K)
E-mail: shahidac940@gmail.com
Mob. 9622653298

ثنا مریم

علی گڑھ تحریک کے تناظر میں تعلیم نسواں

اُردو ادب میں بہت سی تحریکیں وجود میں آئیں، لیکن علی گڑھ تحریک ان تمام تحریکوں میں اپنی ایک انفرادی شان رکھتی ہے۔ یہ صرف ایک تعلیمی مہم نہیں تھی بلکہ سر سید کی سیاسی، سماجی، اور علمی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی اور سیاسی بیداری میں نا صرف اہم رول ادا کیا، بلکہ اُردو شعر و ادب کو صحیح سمت و رفتار عطا کرنے میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

1857 میں پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد برصغیر کے مسلمان مایوسی، معاشی بدحالی، اور برطانوی مظالم کا شکار ہو گئے تھے۔ انگریز انھیں اپنا اصل دشمن سمجھنے لگے تھے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں اور سیاسی سرگرمیوں سے بے دخل کر دیا گیا۔ ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ اس طرح پرانے نظام کے خاتمے نے مسلمانوں کو معاشی طور پر مفلوج کر دیا۔ مسلمانوں میں مایوسی اور قدامت پسندی جڑ پکڑ رہی تھی۔ ایسے میں سر سید احمد خاں نے محسوس کیا کہ جب تک مسلمان جدید تعلیم اور سائنسی سوچ نہیں اپنائیں گے، وہ اس ذلت کے دلدل سے باہر نہیں نکل سکتے۔ انھوں نے علی گڑھ تحریک کے ذریعے مسلمانوں کو اس پسماندگی سے نکالنے کے لیے متعدد کارنامے انجام دیے۔ مثلاً ایم اے او کالج قائم کیا تاکہ وہ جدید علوم اور انگریزی تعلیم حاصل کر کے معاشی طور پر خودکفیل ہو سکیں۔ مسلمانوں کی ذہنی بیداری اور اصلاح کے لیے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ سیاسی تحفظ اور انگریزوں کے دلوں سے مسلمانوں کے خلاف نفرت کو ختم کرنے کے لیے ''اسباب بغاوت ہند'' جیسی کتابیں لکھیں۔ اُردو زبان و ادب کو مشکل پسندی سے نکال کر سادہ اور بامقصد بنانے کی کوشش کی جس سے ادب صرف خواص تک محدود نہ رہے بلکہ عام مسلمانوں کی ترقی کا ذریعہ بھی بنے۔ خلیق احمد نظامی علی گڑھ تحریک کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کے مسلمانوں کی گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی فکری، علمی، مذہبی، سیاسی تاریخ کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس پر سر سید اور علی گڑھ تحریک نے بلاواسطہ یا بالواسطہ اپنے اثرات نہ چھوڑے ہوں، سر سید کی بلند حوصلگی، عزم راسخ، خلوص نیت اور جہد مسلسل نے مشکل کام کو ایک تحریک کی شکل دے دی تھی، زمانے کے پیچ و خم کے ساتھ تحریک کے خدوخال بھی بدلتے رہے، لیکن سر سید کے افکار کی معنویت ہر دور میں بڑھتی ہی رہی۔''[1]

سر سید نے برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی و سماجی اصلاح میں بلاشبہ کلیدی کردار ادا کیا۔ تاہم خواتین کی تعلیم کے حوالے سے ان کے

خیالات پر علمی اور ادبی حلقوں میں ہمیشہ سے بحث رہی ہے۔سر سید احمد خاں کی شخصیت اور خدمات کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ جدید تعلیم کے اتنے بڑے علمبردار ہونے کے باوجود زندگی کے ابتدائی اور وسطی دور میں عورتوں کی تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات کافی حد تک قدامت پسندانہ یا کم از کم محتاط معلوم ہوتے ہیں۔لڑکوں کے لیے اعلی مغربی تعلیم کی حمایت کرنے والے روشن خیال سر سید جب لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق بولتے ہیں تو اکثر اپنے قدیم بزرگوں کے خیالات کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔خواتین کی تعلیم کے ضمن میں سر سید کے یہ خیالات ملاحظہ کیجیے:

''ہمارا منشاء یہی ہے کہ یہ تعلیم جو ہم دے رہے ہیں لڑکوں کی نہیں ہے بلکہ لڑکیوں کی ہے جن کے وہ باپ ہوں گے، جب مرد اس لائق ہو جاتے ہیں عورتیں بھی لائق ہو جاتی ہیں۔''2

سر سید کا بنیادی اصرار اس بات پر تھا کہ قوم کی پہلی ترجیح مردوں کی تعلیم ہونی چاہیے کیونکہ وہی معاشی نظام کی اکائی ہیں۔ان کا خیال تھا کہ اگر مرد تعلیم یافتہ ہو گئے تو عورتوں کی تربیت خود بخود ہو جائے گی۔جب کہ سماجی تجربات سر سید کے اس خیال کی نفی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔یہ خیال کہ پہلے مردوں کو پڑھنا چاہیے ایک ایسی منطق تھی جس نے خواتین کی تعلیم کو ثانوی درجے میں ڈال دیا تھا۔جس طرح ایک پرندے کے دونوں پروں کا مضبوط ہونا اُڑان کے لیے ضروری ہے۔اسی طرح معاشرے کی ترقی کے لیے مرد اور عورت دونوں کی بیک وقت تعلیم لازمی ہے۔صرف مردوں کی تعلیم سے معاشرہ تعلیمی توازن کھو دیتا ہے۔

سر سید نے اپنی والدہ ''عزیز النساء بیگم'' کا ذکر ''سیرت فریدیہ'' کے آخری صفحات میں کیا ہے۔اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے اپنی ماں سے ''شیخ سعدی'' کی ''گلستان'' کے سبق پڑھے اور فارسی کی ابتدائی کتابوں کے سبق سنانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ بلکہ بڑے ہونے کے بعد بھی وہ انھیں نہایت قیمتی اور اعلی اخلاقی مشوروں سے نوازتی تھیں۔یہ مشورے سر سید کے لیے زندگی کے مختلف ادوار میں مشعل راہ ثابت ہوئے۔اور ان کی اخلاقی بلندی کا سبب بنے۔ اگر چہ سر سید کی غیر معمولی صلاحیتیں قدرت کی طرف سے عطاء کردہ تھیں، لیکن ان صلاحیتوں کو صحیح سمت اور ترقی دینے میں ان کی والدہ کا نمایاں کردار تھا۔سر سید کی زندگی کے غیر معمولی کارناموں کے پیچھے ان کی والدہ کی خاموش مگر انتہائی مؤثر تربیت کارفرما تھی، ان کی والدہ کا کردار محض ایک روایتی ماں کا نہیں بلکہ ایک ایسی مربّی اور معلّمہ کا تھا جس نے برصغیر کے مسلمانوں کے سب سے بڑے مصلح کی ذہنی اور اخلاقی بنیادیں استوار کیں۔سر سید کا یہ نظریہ کہ پہلے مردوں کو پڑھانا چاہیے ان کی اپنی زندگی کے تجربے سے تضاد رکھتا ہے۔سر سید کی اپنی زندگی کی مثال ان کی والدہ کا کردار ان کے اپنے نظریے کی سب سے بڑی معززانہ تردید ہے۔

'سرسید کو مردوں کے کالج کے قیام کے لیے شدید فتوی اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا.اس ناسازگار حالات میں اگر عورتوں کی تعلیم کا ذکر کیا جاتا تو ممکن هے که مردوں کی تعلیم کی تحریک بھی ناکام هو جاتی.یعنی سر سید کی قدامت پسندی هو سکتا هے ایک دفاعی حکمت عملی هو.جب قوم اس بات پر لڑ رهی تھی که انگریزی پڑھنا کفر هے تو ایسے ماحول میں عورتوں کے لیے گھر سے باهر نکل کر تعلیم حاصل کرنا ایک ایسا قدم هوتا جس سے پوری تحریک متاثر هو سکتی تھی'

سر سید کی خواتین کی تعلیم سے بیزاری اور عورتوں اور مردوں کی تعلیم کے درمیان کے تضاد کو سمجھنے کے لیے اُس عہد کی سماجی نفسیات اور سر سید کی حکمت عملی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ہندوستانی معاشرہ خاص طور پر مسلمان جدید تعلیم کو مذہب سے بیزاری کے مترادف سمجھتے تھے۔سر سید کو مردوں کے کالج کے قیام کے لیے

شدید فتوی اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔اس ناساز گار حالات میں اگر عورتوں کی تعلیم کا ذکر کیا جاتا تو ممکن ہے کہ مردوں کی تعلیم کی تحریک بھی ناکام ہو جاتی۔یعنی سرسید کی قدامت پسندی ہوسکتا ہے ایک دفاعی حکمت عملی ہو۔جب قوم اس بات پر لڑ رہی تھی کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے تو ایسے ماحول میں عورتوں کے لیے گھر سے باہر نکل کر تعلیم حاصل کرنا ایک ایسا قدم ہوتا جس سے پوری تحریک متاثر ہو سکتی تھی۔اس حوالے سے رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''اس زمانے میں انھوں نے مصاف زندگی کے لیے جو شمشیریں بنائیں وہ تمام تر مسلمان لڑکوں پر مشتمل تھیں، مسلمان لڑکیوں کے بارے میں شاید اس طرح سوچا ہوگا جیسا کہ اب تک ہوتا آیا تھا کہ لڑکوں کی تعلیم مقتضیات زمانہ کے مطابق صحیح خطوط پر ہونے لگے گی، تو لڑکیاں خود اسی رنگ میں ڈھل جائیں گی، اس لیے کہ ایک موقع پر لڑکیوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق جو باتیں سرسید نے کہیں وہ اس گھریلو نظام کی تائید میں تھیں، جو ان کے عہد کی دہلی میں عام طور پر شرفاء میں رائج تھیں، ممکن ہے کہ ان کو اس کا بھی اندیشہ رہا ہو کہ جب لڑکوں کی تعلیم کے نظام نو پر مخالفت کا ایسا طوفان کھڑا ہو گیا ہے تو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر عجب نہیں کہ پورا بیڑا ہی غرق ہو جائے، ممکن ہے سرسید لڑائی کے اس اصول سے واقف ہوں کہ حالت جنگ میں پوری احتیاط اور کوشش اس کی کرنی چاہیے کہ حتی الوسع جنگ کم از کم محاذ پر لڑنی چاہیے۔''3

ممکن ہے کہ سرسید اس وقت کے کٹر مذہبی طبقے کے رد عمل سے بچنا چاہتے تھے تاکہ اصل مشن متاثر نہ ہوں۔لیکن یہ بھی تسلیم کرنا ضروری ہے کہ ان کے دور کے مخصوص حالات نے انھیں خواتین کے تعلیم کے معاملے میں حد سے زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ہر چند کہ عورتوں کی تعلیم صرف ایک فرد کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ ایک پوری نسل کی تعمیر ہوتی ہے۔ایک پڑھی لکھی خاتون اپنی تہذیب اور اقدار کی حفاظت ایک غیر تعلیم یافتہ خاتون سے کہیں زیادہ بہتر اور مؤثر طریقے سے کر سکتی ہے۔تعلیم نسواں کو مردوں کی تعلیم پر کسی صورت مؤخر نہیں کیا جا سکتا۔

'اگرچہ سر سید کی زندگی میں کوئی زنانہ اسکول نہیں کھلا، لیکن ''تحریک علی گڑھ'' نے وہ فضا قائم کر دی تھی، جس سے آگے چل کر خواتین کی تعلیم کی راہیں ہموار ہوئیں۔تحریک علی گڑھ نے وہ شعور بیدار کیا جس نے بیسویں صدی کے آغاز میں مسلم خواتین کے لیے جدید تعلیم کے لیے دروازے کھول دیے، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے توسیعی لیکچروں کی ابتداء اس لکچر سے ہوئی جس میں بیواؤں کے دوسرے عقد اور متعدد زوجات کے مسئلے کو پیش کیا گیا'

اگرچہ سرسید کی زندگی میں کوئی زنانہ اسکول نہیں کھلا، لیکن ''تحریک علی گڑھ'' نے وہ فضا قائم کر دی تھی، جس سے آگے چل کر خواتین کی تعلیم کی راہیں ہموار ہوئیں۔تحریک علی گڑھ نے وہ شعور بیدار کیا جس نے بیسویں صدی کے آغاز میں مسلم خواتین کے لیے جدید تعلیم کے لیے دروازے کھول دیے، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے توسیعی لیکچروں کی ابتداء اس لکچر سے ہوئی جس میں بیواؤں کے دوسرے عقد اور متعدد زوجات کے مسئلے کو پیش کیا گیا۔رسالہ 'تہذیب الاخلاق' میں عورتوں کے حقوق اور دفاع عورتوں کی حالت میں، جیسے عنوانات پر مضامین لکھے گیے۔بعد ازاں سرسید کے رفقاء حالی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد سب نے اپنی تحریروں میں عورتوں کے حقوق کو پیش نظر رکھا۔

1886 میں محمد ایجوکیشنل کانفرنس نے پہلی بار زنانہ تعلیم کے لیے ایک الگ شعبہ قائم کیا۔1902 میں شیخ عبداللہ کو اس شعبے کا سیکرٹری منتخب کیا گیا۔اور یہیں سے خواتین کی تعلیم کے ادارے کی بنیاد رکھنے کی عملی کوششیں شروع ہوئیں۔1904 میں شیخ عبداللہ نے

رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے رسالہ ''خاتون'' جاری کیا۔اس رسالے کے ذریعے قدامت پسند طبقے کے اعتراضات کا علمی جواب دیا گیا۔رسالے کے ذریعے تعلیم نسواں کے حق میں مدلل مضامین لکھے گیے اور یہ ثابت کیا گیا کہ اسلام عورتوں کو علم سے اور تعلیم حاصل کرنے سے نہیں روکتا۔اس۔اسی سال ''انجمن خواتین اسلام'' بھی قائم کی گئی۔اس انجمن کے ذریعے خواتین کو متحرک کیا گیا جس نے اسکول کے لیے فنڈ جمع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

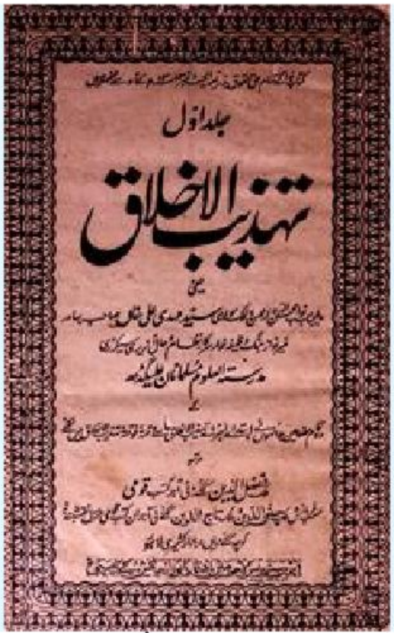

تعلیم نسواں کے زبردست حامی شیخ محمد عبداللہ نے مخالفت کے کسی انجام کی پرواہ کیے بغیر اُس دور میں جب لوگ لڑکوں کی جدید تعلیم کے خلاف تھے، ایسے ناسازگار حالات میں انھوں نے لڑکیوں کے مدرسے کی بنیاد رکھی۔خواتین کی تعلیم کے اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے شیخ عبداللہ کو سب سے بڑی اخلاقی اور عملی قوت جو حاصل تھی وہ ان کی اہلیہ 'وحید جہاں بیگم' تھیں۔اس دور میں مسلمان گھرانے اپنی بیٹیوں کو اسکول بھیجنے سے کتراتے تھے بیگم نے خود گھر گھر جا کر خواتین سے ملاقاتیں کیں، اور انھیں نہ صرف اعلی تعلیم کی اہمیت سے آگاہ کیا بلکہ لوگوں کا اعتماد بھی بحال کیا۔

2 جولائی 1906 یہ ایک تاریخی دن تھا جب علی گڑھ کے بالائی قلعے کے علاقے میں کرائے کے مکان میں گرلز اسکول کا افتتاح ہوا۔بیگم عبداللہ نے اس کی پہلی اعزازی سپرنٹنڈنٹ کے طور پر ذمے داریاں سنبھالیں۔انھوں نے اسکول کے روزمرہ کے معاملات،نظم وضبط اور طالبات کی اخلاقی تربیت کی خود نگرانی کی۔ ادارے کی مخالفت کی ایک بڑی وجہ بے پردگی کا ڈر تھا،بیگم عبداللہ نے اسکول کے اندر پردے کا ایسا مثالی انتظام کیا کہ قدامت پسند طبقہ بھی مطمئن ہو گیا۔1914 میں اسکول کو کرائے کے گھر سے نکال کر اس کی اپنی مستقل عمارت میں منتقل کیا گیا۔جو موجودہ ویمنس کالج کا پرانا حصہ ہے۔1921 میں اسکول کی مقبولیت اور ضروریات کو دیکھتے ہوئے اسے انٹرمیڈیٹ کالج کا درجہ دیا گیا۔1930 میں اسے ڈگری کالج بنا دیا گیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایم اے او کے ایک اہم جز کے طور پر اس کا الحاق ہوا۔آج یہ ادارہ عبداللہ ہال اور ویمنس کالج کے نام سے جانا جاتا ہے۔جہاں ہزاروں طالبات مختلف شعبوں میں اعلی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔یہ ادارہ اس بات کی زندہ مثال ہے کہ شیخ عبداللہ اور ان کی اہلیہ نے جس پودے کو اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔وہ اب ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔اس طرح علی گڑھ ایم اے او کالج کی تاریخ برصغیر کی خواتین کی تعلیم کی جدوجہد کی ایک ایسی داستان ہے، جو شدید مخالفت سے شروع ہو کر شاندار کامیابی پر ختم ہوتی ہے۔

حوالے:

1 سرسید اور علی گڑھ تحریک،خلیق احمد نظامی،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ، 1982

2 سرسید احمد خاں کے لکچرز اور اسپیچز ،مرتبہ امام الدین گجراتی، اجلاس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس،علی گڑھ،1891

3 'شیخ اور سید'،پروفیسر رشید احمد صدیقی،علی گڑھ میگزین خواتین نمبر، نوید انجم،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ،2001

Ms. Sana Mariyam
Research Scholar
Department Of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202002 (U.P)

منچندا بانی کی شعری انفرادیت

ہما کوثر

بیسویں صدی کے نصف آخر میں جن شعرا کو اعتبار حاصل ہوا ان میں ایک اہم نام راجندر منچندا بانی کا ہے۔ اردو غزل میں بانی کی حیثیت ایک نئی آواز کی ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں ایک نئی فضا قائم کی اور نیا ماحول بنایا۔ ان کے یہاں دوسرے شاعروں کی طرح غزل کا عام ماحول نہیں پایا جاتا۔ بانی ابتدا ہی سے ہم عصر شعرا کے درمیان اپنے طرز اظہار اور تخلیقی رویے کے سبب منفرد رہے۔ انھوں نے سکہ بند تغزل پیش پا افتادہ تراکیب اور بھیڑ میں گم ہوجانے والے راستوں سے ہمیشہ گریز کیا۔ ان کی شاعری کی لفظیات، استعارے اور امیجری ہم عصر شعرا سے بالکل مختلف نظر آتی ہیں۔ تین مختصر مجموعہ کلام کے باوجود بانی کو بہت زیادہ لکھنے والے شاعروں پر فوقیت حاصل ہے۔ اس تفوق کا سبب ان کا وہ اسلوب تخلیق اور شعری لہجہ ہے جو انھوں نے مسلسل محنت کو اپنی ذات کے رنگوں سے ہم آہنگ کر کے ترتیب دیا ہے۔ آسانی سے گرفت میں نہ آنے والا ان کا شعری اسلوب ہی ان کی شناخت کا بنیادی وسیلہ ہے۔ بانی کے یہاں تجربہ برائے تجربہ نہ ہوکر تخلیق کا مرتبہ حاصل کرلیتا ہے۔ بانی کو خود اس بات کا احساس تھا جس کا اظہار انھوں نے بیشتر اشعار میں کیا ہے:

چلی ڈگر پر کبھی نہ چلنے والا میں
نئے انوکھے موڑ بدلنے والا میں

شامل ہوں قافلے میں مگر سر میں دھند ہے
شاید ہے کوئی راہ جدا بھی مرے لیے

بانی کا تعلق جدید شاعروں کے اس گروہ سے تھا جنھوں نے اپنی اندرونی مضطرب شخصیت اور غزل کی ہیئت میں زبردست ہم آہنگی محسوس کی اور اردو غزل میں قابل قدر تجربے اور اضافے کیے۔ انھوں نے مختلف سطحوں پر اپنے تجربے کی معنویت سمجھنے کی کوشش کی ہے اور مختلف علامتوں اور استعاروں کے ذریعہ اپنے احساسات بیان کیے ہیں۔

بانی کی شاعری میں لہجے کی انفرادیت اور تخیل کی نادرہ کاری کے ساتھ ساتھ شکستہ دلی اور محزونی کی جاندار فضا نظر آتی ہے۔ متضاد عناصر کی مربوط شمولیت اور فنی اعتبار سے تہہ داری کے سبب مروجہ اصطلاحوں کے ذریعہ ان کی شاعری کی شناخت مشکل ہوجاتی ہے۔ اساتذہ فن کے اثرات قبول کر کے انھوں نے اپنی غزلوں میں کلاسیکی رنگ کا رچاؤ شامل کیا ہے وہیں دوسری طرف جدید غزل کا احساس و اظہار اور نئی لفظیات بھی ان کے شعری سرمائے میں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ کلاسیکی لفظیات اور استعاروں کو انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ اس عمل میں انھوں نے یہ ہنرمندی دکھائی ہے کہ لفظیات اور استعارے تو کلاسیکی ہیں لیکن انھیں نئی تعبیر کے ساتھ پیش کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا لہجہ اور

آہنگ نیا معلوم ہوتا ہے ۔جنوں ،صحرا ،آوارگی ،وحشت ، سودا، آشیاں، بیاباں جیسے بیشتر کلاسیکی الفاظ بانی کی غزلوں نئے سیاق اور نئی تعبیر کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔

آوارگی کا ڈر نہ کوئی ڈوبنے کا خوف
صحرا ہی آس پاس نہ دریا یہیں کہیں

آتش گل ہوئی جب تیز
خود کیے ہم نے آشیاں خالی

ان کی شاعری میں کلاسیکی رنگ و آہنگ کے ساتھ ساتھ جدید حسیت اور نئے زمانے کا کرب بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔تہذیبی شکست و ریخت، انسانی اقدار کی پستی اور بے چہرگی واجنبیت جیسے احساسات بھی نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔زندگی کی بے معنویت کی لائی ہوئی اداسی اور تنہائی انھیں چہار جانب سے گھیرے ہوئے ہے۔تنہائی ان کے یہاں انفرادی احساس کے بجائے اجتماعی تجربہ بن کر سامنے آتی ہے۔یہ زندگی کے انتشار، عدم استحکام،تناؤ اور دباو کا نتیجہ ہے جو وقتاً فوقتاً ان کے احساس کی سطح پر نمایاں ہوتی رہتی ہے۔بھری دنیا میں تنہائی کے احساس،تاریکی،کرب،گمشدگی اور فرار جیسے داخلی مسائل کی پیچیدگیاں وافر مقدار میں ان کی شاعری کو بنیاد فراہم کرتی ہیں۔خوابنا کی ، دل گرفتگی اور تلخی احساس جو خوابوں کی شکست کا لازمی نتیجہ ہے بانی کی غزلوں اور نظموں پر صاف نظر آتی ہے۔لمحہ کم مہرباں، خاک وخلا بے چراغ، نظارہ لاسمتیت ،عکس لاتفسیر،منظر بے چہرگی ،حرف تہی اسم ،سرد سناٹا،لمحہ رائگاں یہ تمام تراکیب منفی اضافتوں کے ساتھ تخلیق کی گی ہیں:

نہ منزلیں تھیں ، نہ کچھ دل میں تھا، نہ سر میں تھا
عجب نظارہ لاسمتیت نظر میں تھا

کیا عجب منظر بے چہرگی ہر سمت نظر آتا ہے
ہر کوئی اور کوئی ہے نہ یہاں میں ہے نہ تو، بھاگ چلو

خاک و خلا بے چراغ اور شب
نقش و نوا بے نشاں اور میں

بانی کی غزلوں میں اظہار واسلوب کے نئے انداز کے عمدہ ترین نمونے ملتے ہیں۔انھوں نے نہ صرف نئ علامتوں سے غزل کے دامن کو کشادہ کیا بلکہ ایسے الفاظ وتراکیب بھی غزل میں شامل کیے جنھیں غزل کے دامن میں سمونا کار دشوار تھا۔بانی کا اصل کمال ہے کہ اظہار کے لیے لفظوں کو نہایت سلیقے سے استعمال کرتے ہیں ۔ پروفیسر عتیق اللہ لکھتے ہیں۔

بانی کی غزل کا بیرونی کردار حشو زواٗد اور یابس سے پاک اور غیر ضروری لوازمات سے مبری ہوتا ہے۔ وہ ایک ایک لفظ کا استعمال بڑے انہاک اور مرکزیت کے ساتھ کرتے ہیں مگر اس طور پر کہ ان کی تخلیقی حسیت اپنی جگہ پر قائم رہے۔،،

(حساب رنگ، بانی، ص9)

ان کے شعری لہجے کے تعین میں نت نئی تراکیب، اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ لہجے کے نشیب وفراز،لفظوں کی تکرار کے ذریعہ نئ جہات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔شکن شکن سا لباس ، پارہ پارہ سا دروں، افق تا افق ڈوبتی شام کا سماں جیسی لفظی تکرار ان کی فنی ہنر مندی اور لہجے کی انفرادیت کی بہترین مثال ہے۔شاعری میں اپنے طرز فکر اور طرز اظہار کی انفرادیت کی تشکیل کی خاطر نئ اضافت اور لفظوں کے نئے جوڑ سے استعارہ سازی کا کام جابجا لیا ہے۔ا

بانی کی تخلیقی محرکات میں مناظر اور مظاہر فطرت کے ساتھ اپنے تجربے کو ہم آہنگ کرنے کا عمل کثرت سے نظر آتا ہے۔مناظر فطرت ان کے یہاں جذبے اور کسی اندرونی کیفیت کا متبادل بن جاتے ہیں ۔مظاہر فطرت سورج ، چاند، ستارے ،شجر ، حجر، افق اور آسمان اپنے وجودی پھیلاو سے مرعوب نہیں کرتے بلکہ انسان کے اندر بننے بکھرنے کے تناظر میں نئ معنوی کیفیات اور نئ تخلیقی جہات کو جنم دیتے ہیں ۔ان کا تجسس اور تحرک استعاراتی اور علامتی اظہار کی صورت میں ایسے پیکر تراشتا ہے جو زمین وآسمان کے بنیادی رشتے سے پوری طرح منسلک ہیں ۔بانی کے تخلیق کردہ استعارے بیشتر مناظر کی عکاسی اوراس سے ابھرنے والے حسی پیکروں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں ۔ پرندہ ، دھند، دھواں اور روشنی ان کے بنیادی

استعارے ہیں۔ان ہی استعاروں کے تلازمات کی بنیاد پر ان کے احساس وادراک اور تجربوں کی جہات اپنی راہیں تلاش کرتی ہیں۔

بس ایک چیخ گری تھی پہاڑ سے یک لخت
عجب نظارہ تھا پھر دھند کے بکھرنے کا
اک دھند میں گم ہوتی ہوئی ساری کہانی
اک لفظ کے باطن سے الجھتی ہوئی تاویل

بانی کی بعض غزلوں کی لفظیات اور فضا میں ہندی اور ہندوستانی عناصر ملتے ہیں۔ان کے یہاں کہیں ہندی لفظوں کے استعمال اور کہیں فضا بندی اور پس منظر سے ہندی تاثر قائم ہوتا ہے۔ان کی بعض نظموں کی بھی فضا ایسی ہے جن کا کوئی نہ کوئی پہلو ہندی زبان کی روح اور مقامی سرزمین سے مربوط معلوم ہوتا ہے مثلاً۔

ناچ صد نشہ وشادابی سے
ناچتی جا اسی مستی میں کہ تو ایک کنول بن جائے
اور تجھ کو کسی تالاب کے سینے میں اتار آئیں ہم
بھوت آکر تری رنگت میں بسیرا کر لیں

ان کی یہ لفظیات اور فضا ہندی ماحول کے اثرات سے مملو نظر آرہی ہیں ۔ اپنی غزلوں میں بھی انھوں نے کثرت سے ہندی لفظیات برت کر اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے۔اپنے اس لسانی تجربے سے غزل کے ذخیرہ الفاظ کو وسیع کیا ہے۔ان کی استعمال کردہ ہندی لفظیات الگ سے جڑی ہوئی نظر آنے کے بجائے غزل کی بنت اور شعر میں تحلیل ہو گئیں ہیں۔ گگن ،شراپ ، سمے ،گھاٹ ،شانت ، سکھی ،کھنڈر، سپاٹ جیسی بیشتر لفظیات فنکاری کے ساتھ شعر کا حصہ بنی نظر آتی ہیں۔یہ سبھی الفاظ پرانی غزل میں کثرت سے نظر نہیں آتے بلکہ اظہار کی سطح پر نئے ہیں،لیکن اس انداز سے برتے گئے ہیں کہ تنافر حروف کی صورت نہیں پیدا ہوئی۔ان میں نہ اکھڑ پن ہے نہ کھردرا پن بلکہ شاعر کے بھر پور شعری تجربے کا حصہ بن کر شعر کی بنت اور ہیئت میں شامل ہو گئے ہیں۔

بانی کے شعری واردات کے بڑے حصے کا نقشہ ڈوبتی شام کے پس منظر میں تیار ہوا ہے۔شام کا منظر ان کے لیے خالی کینوس کی طرح ہے جس پر اپنے تخیل کی مدد سے مختلف رنگ بکھیرتے ہیں ۔زندگی کی تھکن کے سبب جلتے پگھلتے رہنے سے جو سوز پیدا ہوا اسے بیان کرنے کے لیے شام کا استعارہ ان کے یہاں بیشتر مقامات پر استعمال ہوا۔شام کے بیان میں ان کا بصری تخیل ،ادراک کی توانائی اور متحرک پیکر بنانے کی قوت عروج پر نظر آتی ہے۔ڈوبتا ہوا دن ویسے ہی اداسی اور مایوسی لیے ہوتا ہے بانی کے حزنیہ بیان نیا پنے واردات کے اظہار کے لیے اس منظر کی تصویر کھینچنے میں بڑی مہارتیں دکھائی ہیں۔

یاد تری جیسے کہ سرِشام
دھند اتر جائے پانی میں
یہ ذرا سا کچھ اور ایکدم بے حساب سا کچھ
سرِشام سینے میں ہانپتا ہے سراب سا کچھ
کچھ تو دل آپ ہی بجھتا سا چلا جاتا ہے
اور کیا کیا نہ ہوائیں سرِشام آئیں گی

خلاصہ یہ کہ بانی کی شعری آواز اور ان کا لہجہ مقبول عام اسالیب اور لہجوں سے بالکل الگ پہچانا جاتا ہے۔ان کی زبان اپنی جدت اور شعری تجربہ اپنی انفرادیت کے اپنی طرف متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔شعری تجربے کے اظہار میں الفاظ تخلیقی کیفیت سے ہم آہنگ ہو کر جذبہ وخیال کی سچی تجسیم پیش کرتے ہیں۔ان کا احساس و ادراک اور تجربے کی جہات ہمیں اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ شاعر بے پناہ تخلیقی کرب کی زد پر ہے، جو استفہامیہ انداز میں سوچنے کا عادی ہے۔ان کے اندر کا فنکار ٹوٹتے رشتوں، بکھرتی اقدار پر نہ صرف حیران ہے بلکہ ان کے اظہار پر بھی قادر ہے۔اس ملی جلی کیفیت کا نتیجہ ہے کہ ان کے یہاں کبھی سوالیہ لہجہ تو کہیں خود کلامی اور سرگوشی کا لہجہ نظر آتا ہے۔کہیں ماورائی فضا کو سامنے رکھ کر ارتفاعِ معنی کی خواہش ہے اور کہیں زبان کے تخلیقی استعمال سے جذباتی کیفیت اور تخیلی فضا کو بیدار کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔

Ms.Huma Kausar
Research Scholar
Delhi University
195, Eden Enclave, Kursi Road
Lucknow-226026 (U.P)

رفعت اختر

جموں وکشمیر کی منتخب خودنوشتوں کا اسلوبیاتی مطالعہ

اسلوب کیا ہے ؟ادب میں اسلوب کی تشریح وتوضیح مختلف زاویوں سے کی گئی ہے۔اصل میں ادیب یا شاعر کے اظہار خیال کے منفرد انداز کو اسلوب کہتے ہیں۔اسلوب دراصل افکار وخیالات کی ترسیل اور ابلاغ کا وہ دلکش پیرایہ ہے جو ہر فنکار کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ اسلوب، خیالات کے اظہار اور جذبات کی ادائیگی کا وہ ڈھنگ ہے جو نثر اور شعر دونوں پر نمایاں ہوتا ہے۔شعر تخیل اور جذبات کی ترجمانی کرتا ہے، جبکہ نثر سوچنے، سمجھنے اور خیالات کو عمدہ انداز میں بیان کرنے کا نام ہے۔

اسلوب کا لفظ زیادہ تر انسان کی انفرادی خصوصیات سے ہٹ کر اس کے اندازِ بیان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔یعنی کسی فنکار کی شخصیت کا اندازہ اس کے تخلیقی کارناموں سے لگایا جا سکتا ہے۔اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اسلوب فنکار کی شخصیت کا ذاتی وصف ہے اور اسے مصنف کی شخصیت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔سید محی الدین قادری زور اپنی تصنیف ''اردو میں اسالیبِ بیان'' میں لکھتے ہیں:

> ''کسی عبارت کے مطالب ومعانی اپنے مصنف کی چغلی نہیں کھاتے بلکہ اس کا اسلوب بیان پکار اٹھتا ہے کہ میرا لکھنے والا فلاں شخص ہے۔''[1]

نثری اسلوب کے لیے سادگی، سلاست، اختصار اور جامعیت بنیادی شرطیں ہیں۔ خودنوشت سوانح عمری کے لیے بھی یہی خصوصیات ضروری ہیں، البتہ موضوع، مواد اور مخاطب کے لحاظ سے زبان میں فرق آ سکتا ہے۔

ادب کی اصناف میں خودنوشت کا شمار ادبی نثر میں ہوتا ہے۔اس کی بنیادی خصوصیات وہی ہیں جو دیگر نثری اصناف کی ہوتی ہیں، البتہ خودنوشت کی نثر دیگر ادبی نثر کے مقابلے میں زیادہ واضح، سلیس اور متعین ہوتی ہے۔خودنوشت سوانح عمری ایک بیانیہ اور نیم تخلیقی صنف ہے، اس لیے اس کی زبان تخلیقی اور ادبی ہونے کے ساتھ حسنِ بیان سے بھی آراستہ ہوتی ہے۔اردو خودنوشت میں فنونِ لطیفہ، نفسیات اور عمرانیات کے علاوہ خود اظہاریت، تاریخی صداقت، جمالیاتی کیفیت اور ادبیت بھی ناگزیر ہوتی ہے، جن سے کوئی تخلیق کار نظر نہیں چرا سکتا۔خودنوشت کا محور مصنف کی شخصیت ہوتی ہے۔ یہ وہ فن ہے جس میں انسان اپنے قلم سے اپنی زندگی کے حالات کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر اور پسند وناپسند کا بھی اظہار کرتا ہے۔خود نوشت میں مواد خود مصنف کی ذات سے پیدا ہوتا ہے۔اس میں مصنف خود ہی مجرم، خود ہی گواہ اور خود ہی جج بنتا ہے۔شاعر اور ناول نگار کے برعکس خودنوشت نگار تخیل وتصور کے ذریعے اپنی دنیا آباد نہیں کرسکتا، کیونکہ خودنوشت میں صداقت سب سے اہم عنصر ہے۔خودنوشت

میں ہمیں شخصیت کے وہ پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں جن سے مصنف کے علاوہ کوئی واقف نہیں ہوتا۔ اس میں فنکار کی داخلی اور خارجی زندگی یکجا ہوتی ہے۔ اس کی کوئی متعین ساخت نہیں ہوتی، البتہ کچھ اصولوں کا خیال رکھنا ضروری ہے جو کہ اس طرح ہیں۔(1) صداقت (2) شخصیت(3) فن

جموں وکشمیر میں تحریر کردہ منتخب خودنوشتوں کا اجمالی جائزہ

- کشمکش

چودھری غلام عباس

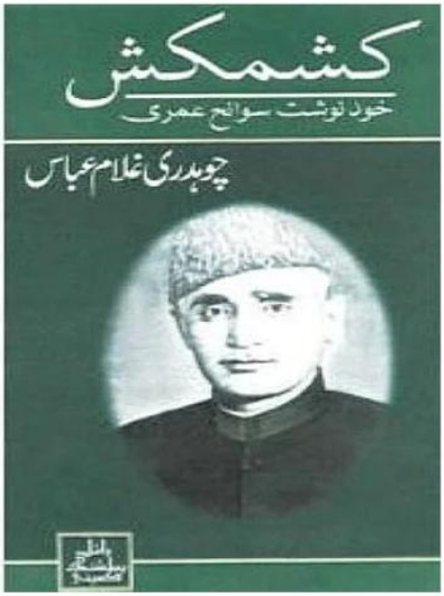

'کشمکش' چودھری غلام عباس کی خودنوشت سوانح عمری ہے، جو 26 ابواب پر مشتمل ہے۔ اس تصنیف میں مصنف نے جموں وکشمیر کے مسلمانوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ کس طرح کشمیری عوام پر ظلم وزیادتیاں ہو رہی تھیں، معصوم بچے یتیم اور خواتین بیوہ کی جا رہی تھیں، اور بے گناہ لوگوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔ الغرض جنت نظیر کشمیر ہر صبح صبح کربلا اور ہر شام شام غریباں بن چکی تھی۔ کشمکش میں چودھری صاحب نے نہ صرف کشمیری عوام کی بے بسی کی داستان پیش کی ہے بلکہ اپنی زندگی کو بھی نہایت سادگی اور خلوص کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنی ذاتی خواہشات اور اہلِ خانہ کو پسِ پشت ڈال کر آزادی کے لیے قلندرانہ جہاد کیا۔

'کشمکش' سب سے پہلے 1950 میں شائع ہوئی۔ اسلوب، فن اور اندازِ فکر کے اعتبار سے یہ اردو ادب کی عمدہ خودنوشتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں نہ صرف تاریخی واقعات کی اہمیت ہے بلکہ چودھری صاحب کی ذاتی زندگی، فکری ارتقا، زندگی کی مشکلات اور جیل کی اذیتوں کا بیان بھی بڑے مؤثر انداز میں کیا گیا ہے۔

اسلوب کے اعتبار سے کشمکش میں دلچسپی اور دلکشی کے بہت سے عناصر موجود ہیں۔ مصنف نے واقعات کو خشک اور روکھے انداز میں بیان کرنے کے بجائے مؤثر الفاظ کے ذریعے انھیں جان دار بنا دیا ہے۔

'کشمکش' کے مطالعے سے مصنف کی پوری زندگی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتے ہیں، دوسروں کی تنقید برداشت کرتے ہیں اور اپنی خامیوں سے دوستوں اور دشمنوں دونوں سے سیکھتے ہیں۔ اس سے ان کی شخصیت مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔ اگرچہ 'کشمکش' کا شمار اردو ادب کی بہترین خودنوشتوں میں ہوتا ہے، لیکن اس میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ سب سے پہلی کمی یہ ہے کہ یہ جزوی ہے اور اس میں صرف اسیری کے آخری ایام کی داستان بیان کی گئی ہے۔ دوسری یہ کہ بعض جگہوں پر مصنف نے واقعات کو سادہ انداز میں بیان کرنے کے بجائے ادبی رنگ دینے کی کوشش کی ہے، جس سے خودنوشت کا ایک اہم وصف یعنی صداقت کچھ کمزور پڑ گیا ہے۔ مختصر یہ کہ کشمکش ایک عمدہ خودنوشت سوانح عمری ہے، جس میں مصنف نے اپنی سیاسی زندگی کے ساتھ سماجی زندگی کو بھی نہایت عمدہ انداز میں قلم بند کیا ہے۔ پوری تصنیف مصنف کی حافظے اور یادداشت کی مرہونِ منت ہے، جس پر داد دینا لازم ہے۔ اس حوالے سے مصنف لکھتے ہیں۔

> ''شروع سے لے کر آخر تک کتاب خالصتاً میرے حافظے اور یادداشت کی مرہون منت ہے۔ اس لیے توقع ہے کہ ذاتی اور واقعاتی فروگزاشتیں محل نظر نہیں ہوں گے۔''2

● متاعِ زندگی

سردار محمد ابراہیم خان

متاعِ زندگی صرف سردار محمد ابراہیم خان کی زندگی کی داستان ہی نہیں بلکہ اس عہد کی تاریخ بھی ہے۔ اس تصنیف میں مصنف نے تمام واقعات کو بے تکلفانہ انداز میں بیان کیا ہے اور کہیں بھی تصنع یا مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا، جو اس خودنوشت کی سب سے بڑی اور نمایاں خوبی ہے۔ سردار محمد ابراہیم خان نے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی اور مشکل حالات میں زندگی کا سفر شروع کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انھوں نے اپنے بھائی اور اس عہد کے رہنماؤں سے مدد مانگی اور مغرب کا سفر کیا۔

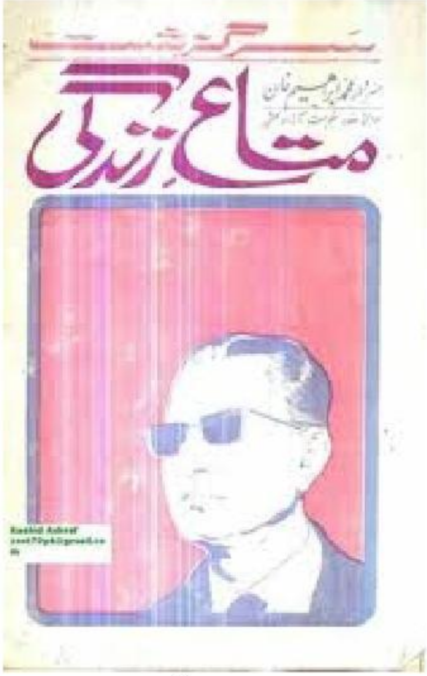

اسلوب کے اعتبار سے متاعِ زندگی میں مصنف نے بے تکلف اظہارِ بیان اور انکشافِ ذات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انھوں نے تمام واقعات کو صداقت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اپنی پیدائش کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''میری پیدائش پر اتنی خوشی ضرور ہوئی کہ ایک بیٹا پیدا ہوا۔ ورنہ جہاں پہلے چھ بھائی بہن ہوں وہاں ایک اور کا ہو جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ابتدائی پرورش گاؤں کے ایک عام بچے کی طرح ہوئی۔ ایک چھوٹے گاؤں میں زمینداروں کو ہزاروں دھندوں کی مصروفیت رہتی ہے، والدین تو صرف بڑی بڑی ضرورتیں مجبوراً مہیا کرتے ہیں۔''[3]

'متاعِ زندگی' میں مصنف نے کہیں کہیں طنز و مزاح سے بھی کام لیا ہے۔ جیسا کہ وہ اپنے ایک استاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مجھے اپنے چھٹی جماعت کے فارسی کے استاد بلا کی رام صاحب کی کہانی یاد ہے۔ بلاکی رام صاحب اس قدر بوڑھے ہو چکے تھے کہ آنکھوں میں بینائی بہت کم رہ گئی تھی۔ فارسی کی کتابیں محض برسوں کے تجربے سے زبانی یاد تھیں، جو پڑھا جاتے تھے انھیں محض کلاس میں جانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ آنکھوں کی بینائی سرے سے تھی نہیں لہٰذا اہم خوب آوازیں کستے تھے۔ جس پر ماسٹر بلا کی رام گالیوں کی بوچھار کرتے تھے۔

پڑھاتے پڑھاتے ان کی عادت تھی کہ منہ پر خوب ہاتھ پھیرتے تھے۔ یار لوگوں نے ان کے سامنے کی میز پر خوب سیاہی بچھادی۔ ماسٹر صاحب نے آتے ہی میز پر ہاتھ مارا اور پھر اپنے منہ پر پیشانی سے تھوڑی تک سیاہی مل دی۔ اس کا علم قطعاً ان کو ہوا ہی نہیں۔ جب اسٹاف روم میں گئے تو باقی استادوں نے ان کا منہ دھلایا۔''[4]

منظر نگاری پر بھی مصنف کو عبور حاصل ہے۔ انھوں نے کشمیر کے مناظر کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ قاری کی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں:

'پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو ایک دوسری دنیا میں لے جاتی تھی، ان پھولوں پر شہد کی مکھیاں اور دوسرے بھنورے چکر کاٹتے ہوئے ایک قسم کی پیاری دلکش موسیقی پیدا کرتے ہیں۔ چڑھتے ہوئے سورج کے وقت یہ سماں بہت ہی بھلا لگتا ہے۔ ڈھلتے ہوئے سورج کے ساتھ ہی سارا علاقہ ایک دل کش سرخی سے رنگین ہو جاتا ہے اور دل کو

رومان کی طرف اکساتا ہے۔ ایسا موسم میں نے اٹلی، فرانس یا سوئٹزرلینڈ میں بھی نہیں دیکھا۔ یہ علاقہ یقینی طور پر اپنی خوبصورتی اور قدرتی مناظر کا ثانی نہیں رکھتا۔''5

مختصر طور پر 'متاعِ زندگی' اگرچہ خودنوشت سوانح عمری کے اعلیٰ ادبی معیاروں پر مکمل طور پر نہیں اترتی، لیکن یہ کشمیر کی تاریخ کے ایک اہم عہد کی مستند دستاویز ہے اور سردار محمد ابراہیم خان کی ذاتی زندگی کی ایک اہم داستان بھی ہے۔

● باتیں ہیں باتوں کا کیا

نذیر جوہر

'باتیں ہیں باتوں کا کیا' جموں و کشمیر کے معروف افسانہ نگار نذیر جوہر کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ ان کا تعلق وادیِ لولاب سے ہے، جو ضلع کپواڑہ کا ایک وسیع اور خوبصورت علاقہ ہے۔

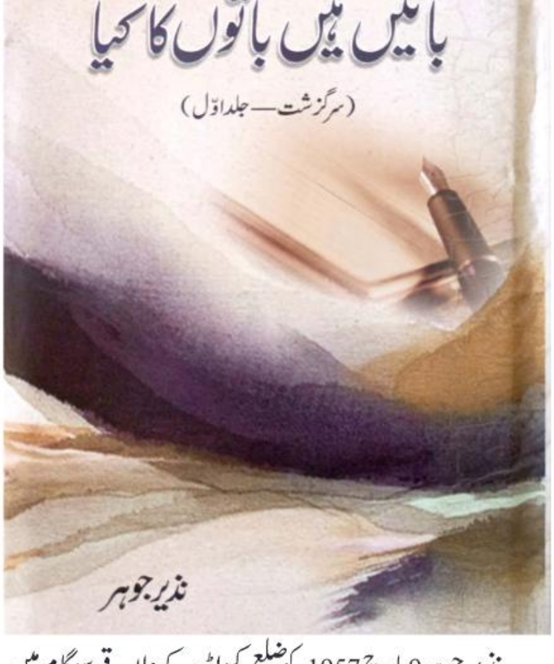

نذیر جوہر 9 مارچ 1957 کو ضلع کپواڑہ کے علاقے سوگام میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ وہ ایک سیاسی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن انھوں نے سیاست کے بجائے ادبی دنیا کو اپنا میدان بنایا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ فوڈ سپلائز میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور پھر اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے لگے۔

نذیر جوہر ایک کامیاب افسانہ نگار اور ناول نگار تھے۔ ان کے ناولوں میں 'یہ نہ تھی ہماری قسمت' اور 'مہربان کیسے کیسے' خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان کے افسانوں میں زیادہ تر سماجی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کی دیگر تصانیف میں 'زندگی یوں تمام ہوتی ہے' بھی شامل ہے۔ باتیں ہیں باتوں کا کیا 34 ابواب پر مشتمل ہے۔

مصنف نے اپنی خودنوشت میں نہ صرف اپنے حالات و واقعات قلمبند کیے ہیں بلکہ دیگر لوگوں کا تذکرہ بھی اس طرح کیا ہے کہ ان کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ انھوں نے اپنے بچپن کے ہر واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ ان کا اسلوب سادہ اور پرکشش ہے، جو قاری کو متاثر کرتا ہے۔

نذیر جوہر نے اس خودنوشت میں نہ صرف اپنی آپ بیتی بیان کی ہے بلکہ جموں و کشمیر کے سیاسی، تاریخی اور سماجی روایات و حالات کی بھی عمدہ عکاسی کی ہے۔ انھوں نے وادی کے رسم و رواج، لوگوں کے باہمی تعلقات اور یہاں کے ماحول کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے دلچسپ واقعات میں 'ماں تجھے سلام' خاص طور پر متاثر کن ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''ماں ایک مکتب ہے، ایک مدرسہ ہے، ایک دانشگاہ ہے۔ ماں ایک چھاؤں ہے، ایک سایہ ہے، ایک احساسِ تحفظ ہے۔ ماں ایک ایسا مکتب ہے جس کی گود میں بیٹھ کر آپ بغیر پڑھے لکھے، بغیر کاغذ قلم کے دنیا کی مشکل سے مشکل زبان سیکھ جاتے ہیں۔''6

زیر بحث تصنیف سے اس عہد کے سماجی حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مصنف نے اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے لکھا ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی بدمزہ اور بے جان تھی، جس کی وجہ سے انھوں نے دیگر محبتیں بھی کیں۔ ''باتیں ہیں باتوں کا کیا'' میں مصنف کی خوش مزاجی، سادگی اور بردباری نمایاں ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بناوٹ، ریاکاری اور ملمع سازی کا کوئی عنصر نہیں۔ ہر واقعہ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں

بیان کیا گیا ہے۔ مختصر طور پر'باتیں ہیں باتوں کا کیا'' کا شمار جموں و کشمیر کی عمدہ خودنوشتوں میں ہوتا ہے۔ اس میں مصنف نے اس عہد کے ادبی اور سماجی حالات کو عمدہ طریقے سے قلمبند کیا ہے۔ تاہم اس کا جزوی ہونا ایک کمی محسوس ہوتی ہے، کیونکہ موت نے انہیں مہلت نہ دی کہ وہ اپنی زندگی کے باقی حصے کو قلمبند کرسکیں۔

● خارستان کا مسافر

مشتاق احمد وانی

مشتاق احمد وانی ہمارے عہد کے مایہ ناز محقق، نقاد، ماہرِ تعلیم اور بہترین افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا، لیکن ایک بہترین استاد نہ ملنے کی وجہ سے شاعری سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور پھر یکسوئی کے ساتھ اردو نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے بے شمار تحقیقی، تنقیدی اور تبصراتی مقالات و مضامین اور افسانے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

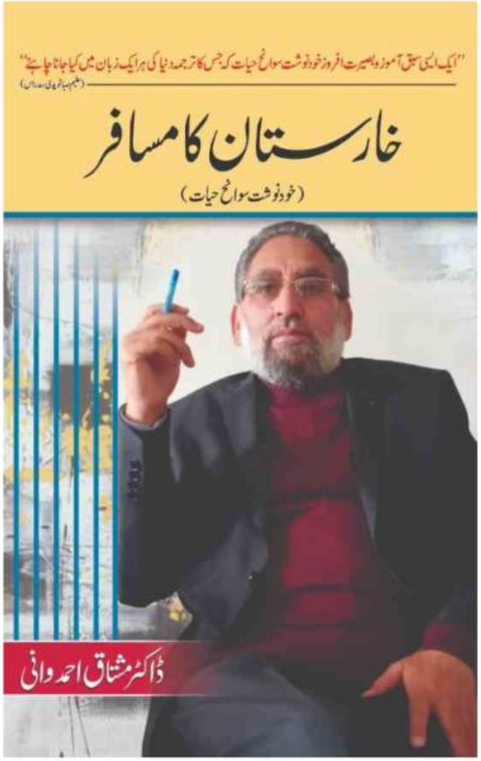

خارستان کا مسافر 360 صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے روایتی ابواب بندی کا التزام نہیں کیا بلکہ خالص ادبی انداز میں اپنی پیدائش سے داستان شروع کی ہے۔ انھوں نے بچپن کے مفلسی اور تنگدستی کے دنوں کے ساتھ اعلیٰ عہدیداروں کی ناانصافیوں کا بھی صداقت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے ''خارستان کا مسافر'' ایک ادبی خودنوشت ہے، جس میں مصنف نے اپنی زندگی کے ساتھ اپنے عہد کے علمی، فکری اور ادبی منظرنامے کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے اس دنیا کو خارستان سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ ان کی نظر میں زندگی کانٹوں کا بچھونا ہے، پھولوں کی سیج نہیں۔ خودنوشت کے لیے تذکرہ رجال بھی اہم ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ اپنے عہد کے بڑے شعرا، ادیبوں اور دانشوروں کا بھی نہایت عمدہ طریقے سے ذکر کیا ہے۔ اس خودنوشت کے حوالے سے علیم صبا نویدی لکھتے ہیں:

''یہ ایک ایسی سبق آموز اور بصیرت افروز خودنوشت ہے جس کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہونا چاہیے۔''7

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری اردو کے اسالیب بیان احمدیہ پریس چار مینار حیدرآباد دکن 1932، ص، 150

2۔ کشمکش، چودھری غلام عباس، مدینہ چوک گاؤں کدل سری نگر کشمیر، 2001 ،ص، 19

3۔ متاع زندگی، سردار محمد ابراہیم خان، دین محمدی پریس لاہور، ص، 63

4۔ متاع زندگی، سردار محمد ابراہیم خان، دین محمدی پریس لاہور، ص 142

5۔ باتیں ہیں باتوں کا کیا، نذیر جوہر، جے این کے۔ پبلی کیشنز، 2021، ص، 67

6۔ باتیں ہیں باتوں کا کیا، نذیر جوہر، جے این کے۔ پبلی کیشنز، 2021 ، ص، 11

7۔ خارستان کا مسافر، مشتاق احمد وانی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2023، ص 9

❑❖❑

Rifat Akhtar
Research Scholar
Delhi University
Gousiya Colony, Near Man Tu Salwa
Restaurant byepass sopore,193201
Jammu & Kashmir

سائنس اور خواتین

تاریخ، خدمات اور امکانات

فیضان احمد کیفی

اگر کسی طالب علم یا باشعور شخص سے سوال کریں کہ دُنیا کا پہلا سائنسداں کون تھا، تو ممکن ہے کہ وہ جواب دینے میں تامل سے کام لے۔ تاریخ کے روشن ادوار میں انسانوں کے بے شمار فتوحات اور حقائق درج ہیں، لیکن پہلے سائنسداں کا حتمی حوالہ دستیاب نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر پوچھا جائے کہ دُنیا کا سب سے معروف سائنسداں کون ہے؟ تو جواب میں البرٹ آئنسٹائن، آئزک نیوٹن، گیلیلیو گیلیلی، چارلس ڈارون، نکولا ٹیسلا، اسٹیفن ہاکنگ، تھامس ایڈیسن، الیگزینڈر گراہم بیل، جیمز واٹ یا رچرڈ فائن مین جیسے نام لیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اگر سوال کو محدود کر کے یہ پوچھا جائے کہ چند مشہور خواتین سائنسدانوں کے نام بتائیں، تو اکثریت دم بخود ہو جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس کے میدان میں خواتین کی خدمات کا اعتراف اس طرح نہیں کیا جاتا جس طرح مردوں کی کامیابیوں کا کیا جاتا ہے۔ اسی لیے اس مضمون میں، سائنسی دنیا میں خواتین کی شرکت، حصہ داری، خواتین کی سائنسی تاریخ اور ان کی نمایاں کامیابی پر اختصار سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن مذکورہ نکات کو سمجھنے سے قبل، سائنس کے اصول وضوابط، اس کا دائرہ کار اور اس کے مقاصد کی وضاحت ضروری ہے، تاکہ موضوع کی مکمل تفہیم ممکن ہو سکے۔

● سائنس کیا ہے؟

سائنس دراصل انسانی ذہانت و فطانت کی وہ محنت ہے جس سے کائنات کے پوشیدہ حقائق جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں یہ نکتہ نہایت اہم ہے کہ یہ محض کتابی علم یا چند اصولوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ انسانی تجربات، مشاہدات اور سوالات پر مبنی ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ زمانہ قدیم میں انسان کا آگ پر قابو پانا، پتھر سے اوزار اور آلات بنانا، آسمان کو دیکھ کر موسم کا اندازہ لگانا یا تاروں کو دیکھ کر وقت اور سمت کا تعین کرنا یہ سب انسان میں سائنسی شعور کی ابتدائی مثالیں ہیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ انسانی شعور میں اضافہ ہوتا گیا اور صدیوں بعد یہی شعور ایک منظّم علم کی صورت اختیار کر گیا۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں سائنس کی جو تعریف کی گئی ہے؛

The intellectual and practical activity encompassing the systematic study of structure and behavior of physical and natural world through observation and experiment.(1)

سائنس ایک فکری اور عملی سرگرمی ہے جو مشاہدے اور تجربے کے ذریعے مادی اور قدرتی دنیا کی ساخت اور رویے کے منظّم

مطالعے پر مشتمل ہے۔
مشہور سائنسدان البرٹ آئنسٹائن نے سائنس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے؛

Science is the attempt to make the chaotic diversity of our sens-experience correspond to a logically uniform system of thoughts.(2)

سائنس وہ کوشش ہے جس کے ذریعے ہمارے حسی تجربات کی بے ترتیبی اور تنوع کو ایک منطقی اور یکساں نظامِ فکر کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکے۔
کارل پاپر نے سائنس میں (Falsiabilty/Testability/Verifiability) کے حوالے سے لکھا ہے؛

"لیکن میں یقیناً کسی نظام کو تجرباتی یا سائنسی صرف اسی صورت میں مانوں گا جب وہ تجربے کے ذریعے آزمائے جانے کے قابل ہو۔ یہ غور وفکر اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کسی نظام کی تصدیق پذیری نہیں بلکہ اس کے غلط ثابت ہونے کی صلاحیت (falsifiability) کو حد بندی کا معیار قرار دیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں، میں کسی سائنسی نظام سے یہ مطالبہ نہیں کروں گا کہ اسے ایک بار اور ہمیشہ کے لیے مثبت معنوں میں الگ کیا جا سکے؛ بلکہ میں یہ مطالبہ کروں گا کہ اس کی منطقی شکل ایسی ہو کہ اسے تجرباتی ٹیسٹوں کے ذریعے منفی معنوں میں الگ کیا جا سکے؛ کسی تجرباتی سائنسی نظام کا تجربے کے ذریعے رد کیا جانا ممکن ہونا چاہیے۔(3)

مندرجہ بالا تینوں تعریفوں کا اگر اجمالی تجزیہ کیا جائے تو آکسفورڈ ڈکشنری کی تعریف سائنس کو سب سے وسیع اور عام انداز میں بیان کرتی ہے۔ جبکہ آئنسٹائن نے سائنس کو زیادہ نظریاتی اور فلسفیانہ تناظر میں سمجھایا ہے، یعنی اسے فکری ہم آہنگی کی جستجو قرار دیا ہے اور آخر میں پاپر نے اسے سب سے زیادہ سائنسی اصولوں سے قریب کر کے بتایا ہے، یعنی سائنس کی قدر صرف اسی وقت ہے جب وہ تجربے سے جھٹلائی جا سکے۔ سائنس کی خوبصورتی بھی اسی میں ہے کہ اگر ایک سائنسداں کوئی فارمولا یا اصول پیش کرتا ہے تو اسی دور یا بعد میں آنے والے سائنسدانوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس فارمولا کو غلط ثابت کر سکیں، اسے مزید بہتر بنا کر پیش کر سکیں یا اس کے وضع کردہ اصول سے اتفاق یا اختلاف کر سکیں۔ الغرض سائنس پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہوتی یہ ہر انسان، قوم اور طبقے کے لیے ہے۔

● سائنس کی وسعت:

سائنس محض ایک مضمون یا شاخ نہیں، بلکہ یہ ایک وسیع میدان ہے جو زندگی کے تقریباً ہر گوشے پر محیط ہے۔ کائنات کی پیدائش سے لے کر انسانی جسم کی گہرائیوں تک، زمین کی تہ سے لے کر ستاروں کی دنیا تک، سائنس نے ہر گوشے کو اپنے احاطے میں سمیٹ رکھا ہے۔ اس کی گہرائی میں جائیں تو یہ دو بڑے حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔1؛ ، قدرتی سائنس (Natural Science) اور دوسری سماجی سائنس (Social Science)۔ قدرتی سائنس میں طبیعیات (Physics)، کیمیا (Chemistry)، حیاتیات (Biology)، فلکیات (Astronomy) اور ارضیات (GEOLOGY) جیسے مضامین شامل ہیں جو کائنات کے مادّی اور قدرتی نظام کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ یہ ہمیں نظامِ کائنات اور اس کے قوانین کے حوالے سے معلومات عطا کرتے ہیں۔ 2، سماجی سائنس، جس میں نفسیات (Pshychology)، بشریات (Anthropology) اور معاشیات (ECONOMICS) شامل ہیں، جو انسانی رویے (حرکات وسکنات) اور معاشرتی نظام کو سمجھنے کا راستہ دِکھاتے ہیں۔ یہ علوم ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان کیسے سوچتا ہے، کیسے برتاؤ کرتا ہے اور معاشرہ کیسے بنتا اور چلتا ہے۔

منجملہ سائنس کی مذکورہ دونوں قسمیں مل کر انسان کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ اپنی دنیا اور خود کو بہتر طور پر پہچان سکے۔ قدرتی سائنس ہمیں کائنات کے بارے میں بتاتی ہے، جبکہ سماجی سائنس ہمیں انسانوں کے بارے میں آگاہ کرتی ہے۔ اس طرح سائنس

ہمارے سامنے ایک مکمل تصویر پیش کرتی ہے جس سے ہم اپنی زندگی اور اپنے اردگرد کی دنیا کو گہرائی سے سمجھ سکتے ہیں۔ سائنس کا مقصد یہی ہے کہ ہم چیزوں کو سمجھیں، سوال کریں اور اس سے مسلسل سیکھتے رہیں۔

صدیاں گزریں، وقت نے کروٹ لی اور تہذیب وثقافت بھی تغیر وتبدیلی کا شکار ہوئیں۔ گردش زمانہ نے سائنس کی دنیا پر گہری چھاپ چھوڑی، جس کے سبب سائنس نے بھی ترقی کے نئے منازل طے کیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب اوزار اور سہولیات میسر آتی گئیں، تو انسان کو موقع ملا کہ وہ علم اور تحقیق میں آگے بڑھے اور اپنی زندگی اور معاشرے کو بہتر بنانے کے طریقے ڈھونڈے۔ ہر دور میں نئے سوالات اور مسائل بھی سامنے آئے، لیکن اس کے ساتھ ہی انسان کو یہ ہمت بھی ملی کہ وہ اپنی عقل اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ان مسائل کا حل نکالے۔ پھر چاہے قدیم یونان اور مصر کا زمانہ ہو، یا اسلامی دورِ حکومت کا سنہری وقت ہو، نشاۃ ثانیہ کا دور ہو یا اٹھارویں اور انیسویں صدی کا صنعتی انقلاب، بیسویں صدی کی ابتدا ہو یا آج کا جدید دور۔ ہر دور میں عقل مند اور تعلیم یافتہ لوگوں نے سائنس کی ترقی اور ایجادات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لوگوں نے مشکلات کا سامنا کیا، اور مشکل حالات میں بھی غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔

مردوں کی طرح خواتین نے بھی ہر دور میں، اپنی حیثیت اور مواقع کے لحاظ سے، سائنسی دنیا میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ وہ وقت جب عورت ہونا جرم اور گناہ کے مترادف تھا، تب خواتین نے نہ صرف اپنی بقا کے لیے جدوجہد کی، بلکہ علم اور سائنس کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہ سفر ان کے لیے بالکل بھی آسان نہیں تھا۔ آج کے اس جدید دور میں بھی برصغیر کی خواتین کو سائنس کے میدان میں اپنا مقام بنانے کے لیے مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے گھریلو جبر اور سماجی دباؤ، نفسیاتی مسائل اور لوگوں کی مخالفتیں۔ لیکن جب کوئی خاتون ان تمام رکاوٹوں کو سر کر کے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیتی ہے، تو یہ کامیابی صرف اس کی نہیں ہوتی، بلکہ ان ہزاروں خوابوں کی نمائندگی کرتی ہے جو بہت سی عورتوں نے دیکھے تو تھے، مگر انھیں پورا نہ کرسکیں۔

تاریخ کے ہر دور میں ہزاروں خواتین نے سائنسی دنیا کو اپنے وجود سے جلا بخشی اور اپنی محنت اور قابلیت سے اسے نئی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔ لیکن ایک مختصر سے مضمون میں سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں، اس لیے یہاں کچھ خواتین کے کارناموں کو عالمی اور برصغیر کی سطح پر تقسیم کر کے ذکر کرنا قرین صواب ہے تاکہ آنے والی نسلیں، خاص طور پر مشرقی معاشرے کی لڑکیاں، سائنس کے میدان کا انتخاب کرنے میں ہچکچاہٹ اور خوف محسوس نہ کریں۔

● عالمی سطح کی مشہور خواتین سائنسدان اور ان کے کارنامے

1: رفیدہ الاسلمیہ Rufaaidah AL Aslamiah

انھیں ساتویں صدی کی پہلی مسلم نرس اور فیلڈ سرجن ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انھوں نے میدان جنگ کے ساتھ اپنا خیمہ لگایا اور زخمی مسلمانوں کا علاج کیا، اور بعد میں دوسروں کو طب کے شعبے میں تربیت بھی دی۔ ساتویں صدی کی ہی زینب العوضیہ ایک معالجہ تھیں جو آنکھوں کے زخموں، ناسوروں اور چوٹوں کے علاج میں مہارت رکھتی تھیں۔

2 سطیطہ المحملی Sutayta AL Mahmali

دسویں صدی کے بغداد میں عظیم ریاضی دانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ الخوارزمی (Al-Khawarizmi) کی الجبرائی (Algebra) روایت میں ماہر تھیں۔ ان سے وراثت (Inheritance) کے مسائل کے لیے باقاعدگی سے مشورہ کیا جاتا تھا اور سوانح نگاروں کے مطابق وہ لوگوں کو اپنی طرف سے ذاتی حل پیش کیا کرتی تھیں۔ بقول بغدادی؛ سطیطہ المحملی اسلامی علوم میں بھی مہارت رکھتی تھیں اور فتوے جاری کیا کرتی تھیں۔

3 العجلیہ بنت العجلی Alijliyyah bint e Al ijliyy

انھیں مریم الاسطرلابیہ کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ دسویں صدی میں حلب اور سیف الدولہ کے دربار میں ایک مشہور اسطرلاب (Astrolobe) ساز تھیں۔ انھوں نے اپنے والد سے یہ ہنر سیکھا اور اسطرلاب بنائے، جو ایک پیچیدہ فلکیاتی آلہ ہے۔ اسطرلاب بنانے کے لیے فلکیات، عملی ریاضی اور دست کاریگری کے علم کی ضرورت

ہوتی تھی۔

4 میری کیوری Marie Curie

پولینڈ میں پیدا ہونے والی ایک فرانسیسی سائنسداں تھیں۔انھوں نے طبیعیات(Physics) اور کیمیا(Chemistry) میں مہارت حاصل کی تھی۔ریڈیو ایکٹیویٹی (Radioactivity) پر تحقیق کی،ریڈیم(Radium) اور پولونیم (Polonium) جیسے قیمتی اور اہم عناصر کی دریافت کیں۔انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں کینسر جیسے لاعلاج مرض کے علاج کے لیے ریڈی ایشن(Radiation) کے استعمال کا طریقہ بتایا تھا۔دو بار نوبل انعام سے نوازی گئیں۔ (1903 Physics,1911 Chemistry)

5 روزالنڈ فرینکلن Rosalind Franklin

برطانوی بائیو فزکسٹ تھیں۔ انھوں نے ڈی این اے کی ساخت کی دریافت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ایکسرے X-Ray اور مالیکیولر (Moleculer) ڈھانچے کو سمجھنے کی مہارت ان کے پاس تھی۔روزالنڈ فرنکلن نے اپنے کریئر میں وائرس کی ساخت اور مائکروسکوپی پر بھی اہم کام کیا۔ان کی سائنسی خدمات کو ان کی وفات کے کافی عرصے بعد تسلیم کیا گیا۔

6 جین گڈال Jane Goodall

تاریخ کی سب سے مشہور (پرائما ٹولوجسٹ) ماہر بندر تھیں۔وہ چیمپینزی (Chimpanzee) پر کام اور جانوروں کے حقوق کی وکالت کے لیے مشہور تھیں۔ان کی خاصیت یہ تھی کہ وہ صرف لیبارٹری تک محدود نہیں رہتی تھیں،وہ تنزانیہ میں درختوں پر بھی چڑھتی تھی اور چیمپینزیز کے رویوں کی نقل اتارتی تھیں تاکہ ان کا اعتماد حاصل کرسکیں اور انھیں قدرتی ماحول میں سمجھ سکیں۔

7 ایڈا لوولیس Ada Lovelace

یہ ایک انگریزی ریاضی داں(Mathematician) تھیں اور چارلس بیبج (Charles Babbage) کی رفیق کار تھیں۔بیبج کے

ڈیجیٹل کمپیوٹر کے لیے انھوں نے ایک پروگرام تیار کیا تھا۔لوولیس کی کاوشیں ہمیشہ یاد رکھی گئی ہیں۔ ابتدائی پروگرامنگ زبان 'ایڈا' Ada انھیں کے نام پر ہے۔اکتوبر کے دوسرے منگل کو ایڈا لوولیس ڈے منایا جاتا ہے،جس میں سائنس،ٹیکنالوجی،انجینئرنگ اور ریاضی میں خواتین کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔انھیں دنیا کا پہلا کمپیوٹر پروگرامر بھی کہا جاتا ہے۔

8 باربرا مک کلنٹوک Barbra MacClintok

جینیٹکس میں ناقابل یقین کارنامہ انجام دیا۔جینز (Genes)

کی ٹرانسپوزیشن دریافت کی۔باربرا کا کام اپنے زمانے سے بہت آگے کا تھا اور کئی سالوں تک اسے یا تو بہت انقلابی سمجھا گیا یا پھر اس کے ہم عصر سائنسدانوں نے یکسر نظر انداز کر دیا۔اپنے ساتھیوں کے رویوں سے سخت مایوس ہوکر انھوں نے اپنے کام کے نتائج شائع کرنا چھوڑ دیے اور لیکچر دینا بھی بند کر دیا،لیکن انھوں نے تحقیق کا دامن نہیں چھوڑا۔بالآخر 1960 اور 70 کی دہائیوں میں جب حیاتیات کے ماہرین نے یہ طے کرلیا کہ جینیٹک مٹیریل ڈی این اے ہے،تب سائنسدانوں نے ان کی ابتدائی دریافتوں کی تصدیق شروع کی۔جب پہچان ملی تو اعزازات وانعامات سے نوازا گیا،جن میں

سب سے نمایاں 1983 کا نوبل انعام برائے جسمانیات (Physiology) اور طب (Medicine) تھا۔

9 الیزابیتھ بلیک ویل Elizabeth Blackwell

امریکہ کی پہلی خاتون تھیں جنھیں طب میں ڈگری سے نوازا گیا تھا۔ طب کے میدان میں خواتین کی تعلیم کی بنیاد رکھی اور خواتین کے لیے اپنا میڈیکل کالج قائم کیا۔ وہ پہلی خاتون تھیں جنہیں برٹش میڈیکل رجسٹر میں شامل کیا گیا، جس کی بدولت انھیں برطانیہ کے ساتھ ساتھ امریکہ میں بھی طب کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت ملی۔

10 ریچل کارسن Rachel Carson

1960 کی دہائی میں ایک ماہر ماحولیات کی آواز سب سے بڑھ کر نمایاں ہوئی اور وہ امریکی سیاست، ثقافت اور خارجہ پالیسی کا مرکزی حصہ بن گئی۔ ان کی کتاب 'سائلنٹ اسپرنگ' نے کیڑے مار ادویات اور کیمیکلز کے انسانوں، پودوں اور جانوروں پر خطرناک اثرات سے خبردار کیا اور یہ ملک کی ماحولیاتی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوئی۔

11 ریٹا لیوی مونٹالچینی Rita Levi Montalicini

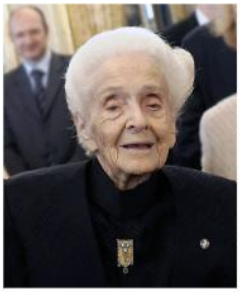

اطالوی سائنسداں تھیں۔ انھوں نے ان کیمیکل اوزاروں کی دریافت میں مدد کی جو جسم کی نشو و نما کو ہدایت دینے اور اعصاب بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ علم موجودہ تحقیقات کی بنیاد بنتا ہے کہ کس طرح یہ عمل دماغی امراض (Dementia) اور کینسر جیسی بیماریوں میں غلط ہو جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا خواتین سائنسدانوں کے علاوہ عالمی سطح پر ہزاروں خواتین سائنسداں ایسی ہیں جنھوں نے سائنسی دنیا میں کارہائے نمایاں انجام دے کر انسانیت کی فلاح و بہبود میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مثلاً؛ گریس ہوپر، میری اینگ، جینیفر ڈوڈن، کیتھرین فریز، ویرا روبن، گرٹروڈ ایلیون، چیئن شیونگ وو، می جیمسن اور فئی فئی لی وغیرہ۔

برصغیر کی خواتین اور بالخصوص ہندوستانی خواتین سائنسدانوں نے بھی سماجی، معاشی اور تہذیبی رکاوٹوں کے باوجود اپنی ایک الگ شاخت بنائی ہے۔ استعماری دور سے لے کر جدید دور تک سائنسی میدان میں غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

12 آنندی بائی جوش Anandibai Josh

آنندی بائی برصغیر کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے 1886 میں پنسلوینیا کے رومن میڈیکل کالج سے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے خواتین کی صحت کو بہتر بنانے کے لیے اچھی کوشش کی لیکن جواں مرگی کی شکار ہوئیں اور 22 سال کی عمر میں ہی تپ دق کے مرض نے ان کی جان لے لی۔

13 جانکی امل Janaki Ammal

یہ ایک بوٹانسٹ تھیں۔ گن (Sugarcane) کی ہائبرڈ اقسام تیار کی اور نیشنل بوٹینیکل انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں حصہ لیا۔ ان کی سائنسی کاوشوں کے مدنظر انھیں 1977 میں پدم شری سے نوازا گیا۔

14 اسیما چٹرجی Asima Chatterjee

آرگینک کیمسٹ تھیں۔ اینٹی ملیریا (Anti Maleri) اور اینٹی ایپلپسی (Anti Epilesy) ادویات پر تحقیق کی۔ ہندوستان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ہولڈ کرنے والی پہلی خاتون تھیں۔ 1975 میں

پدم بھوشن سے نوازی گئیں۔

15 گگن دیپ کنگ Gagandeep Kang

ان کا تعلق بایومیڈیکل سائنس فیلڈ سے ہے۔یہ ہندوستان کی پہلی خاتون ہیں جنھیں 953 سالہ تاریخ میں رائل سوسائیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ انھوں نے انفلوئنزا، ہیپا ٹائٹس اور دیگر بیماریوں پر تحقیق کر کے سائنسی دنیا پر اپنے انمٹ نشان ثبت کیے ہیں۔

16 ٹسی تھامس Tessy Thomas

ان کا تعلق ڈفنس ٹیکنالوجی سے ہے۔انھیں ''مسائل وومن آف انڈیا'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ہندوستان کے بیلسٹک مسائل پروگرام میں اہم کردار ادا کیا اور اگنی میزائل پروجیکٹ ڈائریکٹر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں ہیں۔

17 بِھا چودھری Bibha Chowdhuri

ایک فزکسٹ (Physicist) ہیں۔انھوں نے کاسمک ریز (Cosmis Rays) پر تحقیق کی اور میون پارٹیکل کی شناخت میں اہم کردار ادا کیا۔

18 ریتو کریدھل Ritu Karidhal

ریتو کریدھل ہندوستانی خلائی ایجنسی (ISRO) کی سینئر سائنسداں ہیں۔انھوں نے مریخ مشن (Mars Orbiter Mission) اور چندریان 2 جیسے منصوبوں میں بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔اسی وجہ سے انھیں 'راکٹ وومن آف انڈیا' بھی کہا جاتا ہے۔

19 انپورنی سبرمنیم Annapurni Subramannim

انپورنی سبرمنیم ایک ممتاز ماہر فلکیات (Astronomer) ہیں۔وہ اس وقت انڈین انسٹیٹیوٹ آف ایسٹروفزکس (Indian Institute of Astrophysics) کی ڈائرکٹر ہیں۔ان کی ریسرچ ستاروں کے جھرمٹ (Star Cluster)، ستاروں کی ارتقائی تاریخ اور کہکشاؤں (Galaxies) کی ساخت پر ہے۔

مذکورہ خواتین سائنسدانوں کے علاوہ اور بھی بہت سی خواتین ہیں جنھوں نے سائنسی علوم کو عام کرنے اور لوگوں کو روایت پرستی سے نکال کر بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔کئی خواتین نے تو اپنی پوری زندگی مخصوص علاقے کے بچوں کو سائنس پڑھانے میں گزار دی تاکہ آنے والی نسل توہم پرستی کی شکار نہ ہو،ہمیں ایسی خواتین کی کارکردگی کا بھی بھرپور اعتراف کرنا چاہیے۔

الغرض معاشرے کے ہر طبقے میں سائنس کی اہمیت وافادیت اور اس کی وسعت کی افہام و تفہیم کی اشد ضرورت ہے، تاکہ لوگ اور بالخصوص معاشرے کی خواتین ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی سے نکل کر سائنٹیفک ٹمپرامنٹ (Scientific Temprament) کی حامل بن سکیں۔تاریخ شاہد ہے کہ خواتین نے سماجی و سائنسی علوم کی ترویج و اشاعت میں کتنا اہم رول ادا کیا ہے اور تمام مشکلات کے باوجود اپنی قابلیت اور جاں فشانی سے انھوں نے سائنس کو جن نئی جہتوں سے روشناس کرایا ہے وہ قابل ستائش ہے۔میری کیوری کی ریڈیو ایکٹیویٹی پر تحقیق ہو یا روزالنڈ فرنکلن کی ڈی این اے کی ساخت میں مدد کرنا ہو، ان تمام خواتین نے سائنسی میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ہندوستان میں آنندی بائی جوش کی طبی تعلیم حاصل کرنے کی لگن ہو یا گگن دیپ کنگ کا بائیو میڈیکل ریسرچ میں خدمات انجام دینا ہو، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خواتین کبھی پیچھے ہٹنے والی نہیں رہی ہیں۔

حوالہ جات:

(1)OxfordEnglish Dictionary Page no222

(2)Einstein, Ideas and Opinions, Page no;324

(3)POPPER;The Logic OfScientific Discovery,Page 18

Mr.Faizan Ahmad Kaifi
Research Scholar
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
faizanakaifi1996@gmail.com

سید پرویز قیصر

ارجنٹائنا کی خواتین ہاکی ٹیم تیسری مرتبہ عالمی چیمپئن

مشترکہ میزبان نیدر لینڈس کو پنالٹی شوٹ آوٹ میں شکست دے کر ارجن ٹائنا کی خواتین نے تیسری مرتبہ ہاکی کا عالمی کپ جیتا۔ نیدر لینڈس کے شہر ایمسٹلو ن کے ویگنا راسٹیڈیم میں 10,101 تماشائیوں کی موجودگی میں ارجن ٹائنا اور نیدر لینڈس کے درمیان ہوئے فائنل میچ میں دونوں ٹیمیں مقررہ وقت میں ایک ایک گول سے برابر تھیں۔ 30 ویں منٹ میں نیدر لینڈس کی یبی جیسن نے پنالٹی کورنر پر گول کرکے اپنی ٹیم کو برتری دلادی تھی جس کو 54 ویں منٹ میں ارجنٹائنا کی کپتان ماریہ جوز کراناٹو نے گول کرکے برابر کر دیا تھا۔ پنالٹی شوٹ آوٹ میں ارجنٹائنا نے 1–3 سے کامیابی حاصل کی تھی۔

ارجنٹائنا نے پہلی مرتبہ خواتین کا عالمی کپ 2002 میں جیتا تھا۔ آسٹریلیا کے شہر پرتھ میں ہوئے اس ٹورنامنٹ میں اس نے فائنل میں نیدر لینڈس کو پنالٹی شوٹ آوٹ میں 3–4 سے شکست دی تھی۔ اس فائنل میچ میں مقررہ وقت کے بعد دونوں ٹیمیں ایک، ایک گول سے برابر تھیں۔ 2010 میں اپنے گھر پر ہوئے عالمی کپ میں ارجنٹائنا نے دوسری مرتبہ خطاب پر قبضہ کیا تھا۔ روزاریو میں ہوئے اس عالمی کپ میں ارجن ٹائنا نے نیدر لینڈس کو 1–3 سے شکست دی تھی۔

اس عالمی کپ میں سولہ ٹیموں کو کھیلنے کا موقع ملا تھا جن کو چار گروپوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ گروپ اے میں نیدر لینڈس، آسٹریلیا، جاپان اور چلی کو رکھا گیا تھا جبکہ گروپ بی میں ارجن ٹائنا، جرمنی، امریکہ اور اسکاٹ لینڈ کو جگہ ملی تھی۔ گروپ سی بلجیم، اسپین، آئیر لینڈ اور نیوزی لینڈ کی ٹیموں پر مشتمل تھا جبکہ گروپ ڈی میں چین، ہندوستان، انگلینڈ اور جنوبی افریقہ کی ٹیمیں تھی۔ ہر گروپ سے پہلی دو پوزشن حاصل کرنے والی ٹیمیں دوسرے راؤنڈ میں داخل ہوئیں جبکہ باقی ٹیمیں ٹورنامنٹ سے باہر ہوکر نویں سے سولھویں مقام کے لیے ہونے والے میچوں میں شریک ہوئیں۔ دوسرے راؤنڈ میں گروپ ای میں نیدر لینڈس، آسٹریلیا، ہندوستان اور چین کو رکھا گیا تھا جبکہ گروپ ایف ارجنٹائنا، بلجیم، جرمنی اور اسپین پر مشتمل تھا۔ ان دونوں گروپوں سے پہلی دو پوزیشن حاصل کرنے والی ٹیمیں سیمی فائنل میں کھیلنے کی حقدا بنیں جبکہ باقی دو مقام پر رہنے والی ٹیمیں پانچ سے آٹھویں مقام کے لیے کھیلیں۔ ارجنٹائنا، آسٹریلیا، بلجیم اور نیدر لینڈس کی خواتین ٹیموں نے سیمی فائنل میں کھیلنے کا اعزاز حاصل کیا۔

ارجنٹائنا کو پہلے راؤنڈ میں گروپ بی میں جگہ ملی تھی جس میں جرمنی، امریکہ اور اسکاٹ لینڈ کو جگہ ملی تھی۔ ارجنٹائنا نے جرمنی کے خلاف دو کے مقابلے تین گول سے کامیابی حاصل کی جبکہ اسکاٹ لینڈ کو 0–2 سے شکست دی تھی۔ امریکہ کے خلاف اس کا میچ 1–1 سے برابر رہا تھا۔ اپنے گروپ میں پہلا مقام حاصل کرنے کے بعد ارجنٹائنا نے دوسرے راؤنڈ کا ٹکٹ حاصل کیا۔ دوسرے راونڈ میں اسے گروپ ایف میں رکھا گیا تھا جس میں مشترکہ میزبان بلجیم، جرمنی اور اسپین کی ٹیمیں بھی تھیں۔ اسپین کے خلاف اس نے 0–3

سے جیت حاصل کی جبکہ بلجیم کے خلاف اس کا میچ 0–0 سے برابر رہا تھا۔ دوسرے راونڈ میں گروپ میں پہلی پوزیشن کے بعد اس نے سیمی فائنل میں کھیلنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔

سیمی فائنل میں آسٹریلیا کے خلاف 0-1 کی جیت کے بعد وہ ساتویں مرتبہ فائنل میں داخل ہوئی۔ اس سے پہلے اس نے دو مرتبہ خطاب جیتا تھا جبکہ چار مرتبہ اسے فائنل میں شکست ہوئی تھی۔

نیدر لینڈس کو گروپ اے میں جگہ دی گئی تھی جس میں آسٹریلیا، جاپان اور چلی بھی تھیں۔ نیدر لینڈس نے اپنے تینوں گروپ میچ جیتے اور دوسرے راؤنڈ میں کھیلنے کا اعزاز حاصل کیا۔ چلی کو اس نے 0–2 سے، آسٹریلیا کو 2–4 سے اور جاپان کو 0–9 سے شکست دی۔ دوسرے راؤنڈ میں وہ گروپ ای میں تھی جس میں ہندوستان، آسٹریلیا اور چین کی ٹیمیں بھی تھیں۔ اس نے ہندوستان کو 0–2 سے اور چین کو 1–4 سے شکست دے کر گروپ میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور سیمی فائنل کا ٹکٹ حاصل کیا۔ سیمی فائنل میں اس نے مشترکہ میزبان بلجیم کو 0–1 سے شکست دی اور چودھویں مرتبہ فائنل میں کھیلنے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس نے اس سے پہلے تیرہ مرتبہ فائنل میں داخلہ حاصل کیا تھا جس میں سے نو مرتبہ وہ چمپیئن بنی تھی اور چار مرتبہ اس کو فائنل میں شکست ہوئی تھی۔ اس سے اچھی کارکردگی کسی اور ٹیم کی خواتین کے عالمی کپ میں نہیں ہے۔

تیسرے مقام کے لیے میچ میں بلجیم نے آسٹریلیا کو 0–1 سے شکست دی تھی۔ بلجیم کی خواتین دوسری مرتبہ تیسرا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ اس سے پہلے 1978 میں اس نے تیسرا مقام حاصل کیا تھا۔ بلجیم کی خواتین کی یہ عالمی کپ میں مشترکہ طور پر سب سے اچھی کارکردگی تھی۔

آسٹریلیا کی خواتین کو چوتھی مرتبہ چوتھا مقام ملا۔ آسٹریلیا کی خواتین نے دو مرتبہ خطاب جیتا ہے اور تین مرتبہ انھیں فائنل میں شکست ہوئی ہے۔ دو مرتبہ وہ تیسرا مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔

پانچواں مقام ہندوستان نے جرمنی کو 1–3 سے شکست دے کر حاصل کیا۔ ہندوستان کی خواتین کی یہ عالمی کپ میں دوسری سب سے اچھی کارکردگی تھی۔ اس نے 1974 میں پہلی مرتبہ خواتین کے عالمی کپ میں شرکت کی تھی اور چوتھا مقام حاصل کیا تھا۔ ساتواں مقام اسپین نے حاصل کیا جبکہ چین کو آٹھواں مقام ملا۔ نویں مقام پر انگلینڈ اور دسویں مقام پر امریکہ کی ٹیمیں رہیں۔ جاپان کی خواتین نے گیارہواں مقام حاصل کیا جبکہ اسکاٹ لینڈ کو بارہواں مقام ملا۔ تیرہواں مقام آیئر لینڈ کی خواتین کو ملا جبکہ جنوبی افریقہ کی خواتین چودھویں مقام پر رہیں۔ پندرہواں مقام نیوزی لینڈ کی خواتین کے پاس رہا جبکہ چلی کی خواتین سولہویں اور آخری مقام پر رہیں۔

اس عالمی کپ میں جو پچاس میچ ہوئے اس میں 3.54 گول فی میچ کے حساب سے 177 گول ہوئے۔ ایک سو گیارہ کھلاڑیوں نے اس عالمی کپ میں گول کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ایک عالمی کپ میں سو سے زیادہ کھلاڑیوں نے گول کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ نیدر لینڈس کی یبی جینسن نے سب سے زیادہ آٹھ گول کیے۔ ان کی ہم وطن ماری جن وین پانچ گولوں کے ساتھ دوسرے مقام پر رہیں۔ تیسرا مقام مشترکہ طور پر ارجنٹائنا کی اگستینا گورزیلانی، چین کی ژو میرونگ، بلجیم کی کارلوٹ انگلی برٹ اور ہندوستان کی نونیت کور نے حاصل کیا۔ چاروں کھلاڑیوں نے چار۔ چار گول داغے۔

سب سے زیادہ گول نیدر لینڈس کی خواتین نے کیے جبکہ سب سے زیادہ گول چلی اور جنوبی افریقہ کے خلاف ہوئے۔ نیدر لینڈس کی خواتین نے سات میچوں میں 23 گول کیے جبکہ چلی اور جنوبی افریقہ کے خلاف چھ۔ چھ میچوں میں 19۔19 گول ہوئے۔ سب سے کم گول جنوبی افریقہ کی خواتین نے مارے جبکہ ارجن ٹائنا اور نیدر لینڈس کے خلاف سب سے کم گول ہوئے۔ جنوبی افریقہ نے چھ گول مارے جبکہ ارجن ٹائنا اور نیدر لینڈس کی ٹیموں نے چار۔ چار گول کھائے۔

خواتین ہاکی کے عالمی کپ میں پہلے چار مقام پر رہنے والی ٹیمیں:

سال	مقام	پہلا مقام	دوسرا مقام	تیسرا مقام	چوتھا مقام
1974	مانڈیلیولانپول، فرانس	نیدر لینڈس	ارجنٹائنا	جرمنی	ہندوستان
1976	برلن، جرمنی	جرمنی	ارجنٹائنا	نیدر لینڈس	بلجیم
1978	میڈرڈ، اسپین	نیدر لینڈس	جرمنی	بلجیم	ارجنٹائنا

1981 بیونس آئیرس، ارجنٹائنا جرمنی نیدرلینڈس سوویت یونین آسٹریلیا
1983 کوالالمپور، ملیشیا نیدرلینڈس کنیڈا آسٹریلیا جرمنی
1986 ایمسٹلویں، نیدرلینڈس نیدرلینڈس جرمنی کنیڈا نیوزی لینڈ
1990 سڈنی، آسٹریلیا نیدرلینڈس آسٹریلیا جنوبی کوریا انگلینڈ
1994 ڈبلن، آئیرلینڈ آسٹریلیا ارج ٹائنا امریکہ جرمنی
1998 اتریخ، نیدرلینڈ آسٹریلیا نیدرلینڈس جرمنی ارجن ٹائنا
2002 پرتھ، آسٹریلیا ارجن ٹائنا نیدرلینڈس چین آسٹریلیا
2006 میڈرڈ، اسپین نیدرلینڈس آسٹریلیا ارجن ٹائنا اسپین
2010 روزاریو، ارجن ٹائنا ارجن ٹائنا نیدرلینڈس انگلینڈ جرمنی
2014 دی ہیگ، نیدرلینڈس نیدرلینڈس آسٹریلیا ارجنٹائنا امریکہ
2018 لندن، انگلینڈ نیدرلینڈس آئیرلینڈ اسپین آسٹریلیا
2022 ٹیراسا، اسپین نیدرلینڈس ارجنٹائنا آسٹریلیا جرمنی
2026 ویور، بلجیم ارجنٹائنا نیدرلینڈس بلجیم آسٹریلیا

**2022 اور 2026 میں ایمسٹلوین، نیدر لینڈس نے مشترکہ میزبانی کی تھی۔

❒❖❒

S.Pervez Qaiser
1407 Qasin Jan Street,
Ballimaran,
Delhi-110006

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر...................................... بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/145 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009
میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....
پتہ : ....
....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066
فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

خوشبو پروین

زندہ رہنے کا یہ انداز ہے مرنے کے لیے
صبح یکجا کروں ہر شام بکھرنے کے لیے

صاف گوئی کو مری خوف نہیں آتا ہے
کیا ضرورت ہے کسی سے مجھے ڈرنے کے لیے

تند موجوں سے ہوں میں برسرِ پیکار ابھی
ایک تنکا بھی نہیں پار اترنے کے لیے

ما سوا یاد کے تیری مجھے کچھ یاد نہیں
اب کوئی کام نہیں ہے مجھے کرنے کے لیے

بیٹھے بیٹھے نہیں ملتی ہے کسی کو عزت
حوصلہ چاہیے کچھ حد سے گزرنے کے لیے

گھر کے لوگوں کی ضرورت کبھی تھمتی ہی نہیں
وقت ملتا ہی نہیں خود کے سنورنے کے لیے

زخم پہ زخم سہے جانا ہے مجھ کو خوشبو
اور بے بس ہوں میں ایک آہ بھی بھرنے کے لیے

Khushboo Perween
H12, F irst Floor Haji Colony,
Ghaffar Manzil, Jamia Nagar
New Delhi-110025

فوزیہ اختر ازکیٰ

زورِ سیلابِ الم کم بھی نہیں ہوتا ہے
گوشۂ چشم مگر نم بھی نہیں ہوتا ہے

یوں ہوا دل مرا بے حس کہ کسی بات پہ اب
خوش بھی ہوتا نہیں برہم بھی نہیں ہوتا ہے

اک ستارہ مجھے رکھتا ہے منوّر شب بھر
صبح کے نور میں پھر ضم بھی نہیں ہوتا ہے

جتنا الجھا ہوا ہر فرد ہے اس دنیا کا
اس قدر الجھا تو ریشم بھی نہیں ہوتا ہے

ظلم ڈھاتے ہوئے ظالم یہ کہاں سوچتے ہیں
قہرِ قہّار کا یکدم بھی نہیں ہوتا ہے

مستقل ضرب سے ٹوٹا نہ درِ دل اب تک
اتنا مضبوط تو شیشم بھی نہیں ہوتا ہے

غم امربیل ہے لپٹا ہی رہے گا مجھ سے
اس کے مرجھانے کا موسم بھی نہیں ہوتا ہے

چارہ سازی کے لیے جاؤں کہاں میں ازکیٰ
روح کے زخم کا مرہم بھی نہیں ہوتا ہے

Fauzia Akhter Azka
C/o Md Shahid Iqbal
8B, 1st Floor, Dent Mission Road
Khidderpur, Kolkata-700023(W.B)
fauziapinty786@gmail.com

عذرا انجم

اک زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے
اب یہ عالم ہے کہ دیدار کو ترستے ہیں

وہ جو آ آ کے گرجتے ہیں صبح و شام یہاں
وہی بادل ہیں جو شاید کبھی برستے ہیں

جانے والا بھی پلٹ آئے گا اک روز کبھی
بس اسی آس میں دن رات راہ تکتے ہیں

جس کے پیروں تلے جنت لکھے دیتا ہے خدا
کیسے ناداں ہیں، اُسی ماں کو جو جھڑکتے ہیں!

جس کی محنت کی کمائی پہ پلے تھے بچے
اُف! اُسی باپ سے دامن کو یہ جھٹکتے ہیں

اب نہ لکھ اور حساب غم دوراں عذرا
دیکھ! جابر تیرے اشعار پر بھڑکتے ہیں

Dr. Azra Anjum
G9/10Batla House,
Allama Iqbal Road
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025
azrancert@gmail.com

نورینہ پروین

شکوہ کریں کیوں کر

ہاں یہی گاؤں ہے
جس کے دونوں کناروں پر
درختوں کی قطاروں میں
پیڑ کی چھاؤں میں
جی چاہتا ہے
دم بھر کو ستا لوں
نہ جانے کون سی گھڑی آ جائے
کہ جب ڈیولپمنٹ کے نام پر
یہ زمیں دوز ہو جائیں!

انھیں گاؤں کے اطراف میں
آباد ہے اک دنیا
جس میں وہ مخلوق بستی ہے
جو مزدور و کسان کے نام سے
موسوم ہوتی ہے/جنھیں اکثر حقارت سے
''دیہاتی'' بھی کہتے ہیں/کبھی پوچھا ہے ان سے؟
بارش کی اذیتیں/گرمی کی شدت
اور ٹھنڈ کی سہرن/جسے ہنس کر مزے سے کاٹ دیتے ہیں!

ہاں! اسی کو گاؤں کہتے ہیں/جہاں کی خوشبو میں
اب بھی سادگی/معصومیت/اور پیار بستے ہیں!!

❒❖❒

Dr. Nurina Parveen
Village & Post- Kasenda, Block- chail
District- Kaushambi-212202 UP,
Email ID: parveennurina@gmail.com
Mobile: 7668716712

پہچان

زیبا ناز

''زندگی اک سفر ہے سہانا، یہاں کل کیا ہو کس نے جانا''

نواب آفتاب صاحب کے گنگنانے کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

باہر برآمدے میں بیگم فرخندہ خانم ٹھاٹھ باٹ سے اپنے چھپرکھٹ پر گاؤ تکیہ لگائے پان لگا رہی تھیں۔ پان کو منہ میں رکھتے ہوئے، نواب صاحب سے گویا ہوئیں......آپ کی اس 15 ایکڑ زمین کے مقدمے کا کیا رہا،اس دور میں جائیداد رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ اگر وہاں کوئی میڈیکل کالج یا انسٹیٹیوٹ قائم ہوجائے تو بہتر رہے گا۔

ہوں ں ں!نواب صاحب نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا! آپ کی بات درست ہے لیکن اب بہت دیر ہوچکی ہے یہ فیصلہ ہمیں ارباز کے امریکہ جانے سے پہلے کرنا چاہیے تھا۔

کچھ وقفے بعد نواب صاحب آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے، دراصل کسی بھی کام کی کامیابی کے لیے اس کام کے کرنے کا فیصلہ صحیح وقت پر لینا بہت ضروری ہوتا ہے، خیر! اللہ مالک ہے۔ارباز اپنی پڑھائی میں جی جان سے جٹا ہوا ہے ہمیں بھی اس کے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔بیگم آپ کا مشورہ مفید ہے۔

تبھی پچھیت کے مکان سے رونے چلانے کی صدائیں بلند ہوئیں۔یوں تو راستے کا درمیانی فاصلہ خاصا تھا ۔لیکن دونوں مکانوں کی پچھیت تقریباً ملی ہوئی تھی

بیگم فرخندہ نے گھبرا کر ملازم کو پکارا ،غفران غفران یہ کیسی آوازیں ہیں، ذرا دیکھو تو سہی !اللہ خیر کرے!

جی بیگم صاحبہ، ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔

واپس آکر غفران نے بتایا......کچھ نہیں بیگم صاحبہ ! شیلا دیوی اپنی بیٹی سشما پر غصہ ہو رہی ہیں۔

ایسا کیا کر دیا سشما نے کہ انھوں نے آسمان ہی سر پر اٹھا لیا۔

غفران نے کہا وہ سشما سے کہہ رہی ہیں کہ تم اسکول نہیں جاؤ گی۔

تھوڑی دیر بعد صدائیں پھر بلند ہوئیں......غفران کچھ کہنا ہی چاہتا تھا، لیکن بیگم نے اس کو منھ پر انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے خاموش کر دیا اور آوازوں کی جانب ہمہ تن گوش ہوگئیں۔

سشما کی آواز آرہی تھی ، میں تو پڑھوں گی ماں...... ماں مجھے اسکول جانا ہے، مجھے فیس دے دو نہیں تو میری میڈم اسکول سے میرا نام کاٹ دیں گی۔اوں......اوں......اوں۔

تیری فیس کا انتظام کروں یا تم چاروں کے پیٹ کی آگ بجھاؤں......ماں کی آواز میں غصہ اور ملال کی آمیزش تھی ،وہ خود کو بے بس اور مجبور محسوس کر رہی تھی ، مایوسی کے بادل چھا جانے پر زبان ہی ساتھ نبھاتی ہے لیکن جب بولتے بولتے آواز بھرّا گئی تو وہ دم مسوس کر خاموش ہوگئی۔

ماں مجھے فیس دے دو...... سمجھ میں نہیں آئی تیرے! بہت ہوگئی پڑھائی وڑھائی گھر کا چولہا چوکا سنبھال اور محنت مزدوری کر کے اپنا اور چھوٹے بہن بھائیوں کے پیٹ کی فکر کر، جب زندگی ہی نہ ہوگی تو پڑھائی لکھائی کیا کرلے گی۔

سشما کے رونے کی آواز بند ہوگئی ،لیکن اس کی سسکیاں سناٹے میں گونج رہی تھی ۔جیسے سونے جنگل میں منجیرہ بول رہا ہو لیکن کچھ دیر بعد سسکیاں گویا کویں میں ڈوبتی چلی گئیں اور معصوم نیند کی آغوش میں غڑغپ ہوگئی۔

بیگم کو کچھ دیر بعد پھر خیال آیا...... بولیں غفران ذرا دیکھ تو آؤ سب ٹھیک ٹھاک ہے...... ماحول ساز گار محسوس ہو تو شیلا اور سشما کو بلالاؤ۔

غفران اٹھتے ہوئے جی بیگم صاحبہ ابھی جاتا ہوں۔

بیگم کے ملازم کو دیکھ کر شیلا بھانپ گئی کہ ...... چیخ پکار کی آوازیں دور تک گئی ہوں گی، گھر کے حالات پر اب تک جو پردہ ڈالا تھا بے سود ثابت ہوا، بیگم کو بھی سب اندازہ ہوگیا ہوگا۔ وہ تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہیں، شیلا مختلف خیالات میں الجھتی اور سلجھنے کے راستے تلاش کرتی رہی ،اپنے آپ کو ہر قسم کے سوالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتی رہی کہ کوئی پوچھے گا تو صاف صاف کہہ دوں گی ،آخر کب تک زندگی سے جنگ لڑتی رہوں، میرے بچے ہیں جو چاہوں سو کروں، لیکن بیگم کے لیے یہ جواب مناسب نہیں، بلانے پر نہ جائے یہ بھی ٹھیک نہیں اس کے لیے بیگم کی بات ٹالنا مشکل تھا، دیرینہ تعلق ،بیگم کی بے لوث محبت اور ان کے احسانات کو وہ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ خیالات کے تانے بانے کو توڑ تاڑ کے ،خود کو آمادہ کرتے ہوئے اس نے خود کو تازہ دم محسوس کیا۔ اٹھی اور فٹا فٹ سشما کو سوتے سے جھنجھوڑ کر بولی اٹھ بیگم جی بلاتی ہیں۔ شیلا کی آواز میں مسرت اور رجائیت کی ترنگیں دوڑ رہی تھیں۔

سشما کچھ کسمسائی ،کھسیائی ابھی نیند کچی تھی ،اسے بھوک بھی لگی تھی لیکن غفران کو سامنے دیکھ کر کچھ کہہ نہ سکی۔ ماں نے اسے بیٹھا کر جوتیاں پہنائیں ،اس کے اور اپنے منہ پر پانی کا چھپکا مارا ساڑی کے پلو سے منہ پونچھتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی غفران کے ہمراہ چل دی۔

بیگم نے باہیں پھیلا کر دونوں کا استقبال کیا اور غفران سے پانی لانے کو کہا...... دونوں نے پانی پی لیا تو بیگم نے نہایت اپنائیت سے کہا، شیلا آج ایسا کیا ہوا؟ کہ بچی بہت روئی اس کے رونے چلانے کی فلک شگاف آوازیں ہماری سماعت کے پردے مجروح کیے دیتی تھیں۔

شیلا خاموشی سے سر جھکائے مجرم کی طرح کھڑی رہی...... بیگم نے قدرے توقف کے بعد پھر کہا، حالانکہ یہ آپ کا گھریلو معاملہ ہے لیکن انسانیت کے ناطے کچھ تو ہمارا بھی فرض بنتا ہے۔

شیلا نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا...... بیگم جی آپ کو کیا بتاؤں اتنی مہنگائی ہو رہی ہے یہ تین تین لونڈیاں اور ایک لونڈا انھیں کہاں سے پڑھاؤں لکھاؤں ان کے بابا کیا کماتے ہیں یہ تو اب سبھی کو پتہ چل گیا ہوگا۔ ایسی مہنگائی میں بچوں کا پیٹ پالنا ہی دوبھر ہے اتنا کہہ کر شیلا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ، وہ ہمت جٹا کر بھی آگے ایک لفظ نہ بول سکی۔

بیگم شیلا کی ڈھارس بندھاتے ہوئے بولیں، دل چھوٹا نہ کرو شیلا...... سب دن ایک سے نہیں ہوتے، سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا ......حوصلے سے کام لو...... اللہ بہت مہربان ہے۔ سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

برا نہ مانو تو ایک بات کہوں شیلا!

شیلا خود کو سنبھالتے ہوئے...... بیگم جی اتنے برسوں سے آپ مجھے دیکھ رہی ہیں، میری عادت تو آپ پہچان ہی گئی ہوں گی کہ میں نے کبھی آپ کی بات کا برا نہیں مانا اور نہ ہی کوئی بات ٹالی۔

تبھی...... گفتگو کے دوران، دروازے پر دستک ہوئی۔

چھوٹی بیٹی...... ! ماں...... !بابا بلا رہے ہیں۔

جلدی چلو......۔

ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔ تم چلو......۔

نہیں ماں! ابھی چلو۔ میرے ساتھ۔

بیگم نے کہا...... شیلا! اس وقت بات نہیں ہو سکتی، تم گھر چلی جاؤ۔ آج نہیں پھر کبھی۔

ٹھیک ہے بیگم جی...... شیلا کھڑی ہو جاتی ہے۔ اچھا میں پھر آتی ہوں...... نمستے...... گھر جاتے وقت شیلا کے دل میں طرح طرح کے سوال اٹھتے اور پانی کے بلبلے کی مانند ختم ہوتے رہے۔ وہ پہروں اسی کش مکش کا شکار رہی کہ بیگم نہ جانے کیا بات کریں گی؟

سوچ رہی ہوں ...... کبھی کبھار سشما پڑھنے تو آتی ہی رہتی ہے۔ تھوڑا بہت اس سے گھر کا اٹھائی بٹھائی کا کام لے لیا کروں۔ جیسے شیلا ایماندار تھی کبھی کام سے اس نے جی نہیں چرایا، بے ایمانی نہیں کی، بیٹی بھی کچھ کام دھام کرے گی تو پیسا بھی ملے گا اور محنت کی عادت بھی پڑے گی۔ اپنی پڑھائی کا خرچ تو اٹھا ہی لے گی۔

شیلا کے جانے کے بعد بیگم نواب صاحب سے کہنے لگیں، اس مہنگائی کے دور میں غریب آدمی کا جینا بہت دشوار ہے۔ شیلا کو ہی دیکھ لیجیے کیا کرے بے چاری!

سوچ رہی ہوں ...... کبھی کبھار سشما پڑھنے تو آتی ہی رہتی ہے۔ تھوڑا بہت اس سے گھر کا اٹھائی بٹھائی کا کام لے لیا کروں۔ جیسے شیلا ایماندار تھی کبھی کام سے اس نے جی نہیں چرایا، بے ایمانی نہیں کی، بیٹی بھی کچھ کام دھام کرے گی تو پیسا بھی ملے گا اور محنت کی عادت بھی پڑے گی۔ اپنی پڑھائی کا خرچ تو اٹھا ہی لے گی۔

نواب صاحب نے کہا آپ بجا فرما رہی ہیں بچی کا مستقبل سنور جائے گا، برے ماحول سے بھی بچ جائے گی، آج کل ماحول بہت خراب ہے۔............ مگر؟

مگر کیا؟ بیگم نے تعجب سے دریافت کیا؟

کیا اس کے ماں باپ اس بات کو گوارہ کریں گے؟

بات کرنے پر پتا چل جائے گا...... بیگم نے بے اعتنائی سے کہا۔

اگلے دن صبح ہوتے ہی شیلا تجسس بھرے انداز میں...... بیگم جی نمستے!

بیگم نے کہا...... ارے شیلا، اتنی صبح...... آؤ بیٹھو۔

شیلا نے کہا ہاں بیگم جی...... بچے سو رہے تھے موقع دیکھ کر فوراً نکل آئی ورنہ کبھی کچھ کبھی کچھ یہ لوگ مجھے اپنے کاموں میں الجھائے رکھتے ہیں۔

بیگم نے متانت سے کہا...... شیلا بات دراصل یہ ہے کہ تمھاری سشما بہت پیاری بچی ہے، چھٹ پن سے ہی مجھے اس سے بہت لگاؤ ہے۔ جب وہ تمھارے ساتھ آتی تھی تم نے بھی دیکھا کیسے دوڑ دوڑ کر میرے کام کیا کرتی تھی، کبھی میرا سر دباتی تو کبھی ہاتھ پیر، بہت اچھی بچی ہے۔ وہ میری اپنی اولاد کی طرح ہے اس کی موجودگی میں کبھی مجھے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ میں بیٹی سے محروم ہوں۔

باتیں کرتے وقت بیگم، شیلا کا چہرہ دیکھ رہی تھیں، وہ اس کے ہاؤ بھاؤ پڑھ رہی تھیں، انھوں نے قدرے ٹھہر ٹھہر کر کہا کیا تم یہ گوارہ کرو گی کہ وہ میرے ساتھ رہے۔ میری اپنی بیٹی بن کر...... اس کا لالن پالن پڑھائی لکھائی شادی بیاہ کا خرچ میری ذمے داری ہوگی۔

بیگم جی آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ وہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔ یہ اور وہ دو گھر تھوڑے ہی ہیں۔

ہاں میں جانتی ہوں تم سب میرے اتنے نزدیک ہو کہ مجھے دوئی کا احساس ہی نہیں ہوتا، لیکن میں چاہتی ہوں میری بیٹی ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ بیٹیاں ہی تو ماں کا سہارا ہوتی ہیں۔

گھر میں مشورہ کر لو، آرام سے بتا دینا۔

ٹھیک ہے بیگم جی...... شیلا عجب سی کشمکش کا شکار ہو گئی، ایسا اس نے سوچا بھی نہ تھا، اس کا دل ہچکولے کھانے لگا، وہ خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں اس کے بابا سے بات کر کے آپ کو جواب دیتی ہوں''۔

اگلے دن شیلا شوہر سے بات کر کے بیگم کے پاس سشما کو لے کر آئی۔

''آؤ آؤ شیلا ......'' بیگم نے پرمسرت انداز سے باہیں پھیلا کر ہمیشہ کی مانند دونوں کا استقبال کیا۔

سشما نے جھک کر بیگم کے پیر چھوئے .... ارے نہیں نہیں!

آؤ میری بچی میرے گلے لگ جاؤ۔ بیگم نے اسے سینے سے لگا کر چین کی سانس لی۔

بیگم کے سینے سے چمٹی سشما نے سینے اور آنکھوں کے درمیان حائل جھری میں سے ماں کو دیکھ کر سرد آہ بھری اور آنکھیں موند لیں ۔ماں نے بیٹی پر حسرت سے نظر ڈالی، اس وقت کی خاموشی زبانِ حال بن گئی تھی۔ کسی کو ایک لفظ بولنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

ماں کا اب وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تھا لہٰذا وہ چلی گئی۔

سشما بیٹا جب تم پیدا ہوئی تھیں ، میں نے تبھی تمھاری ماں سے کہا تھا کہ تمھاری بیٹی غیر معمولی صلاحیت کی مالک ہے ، پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔ بہت پیار کرتی تھی میں تمھیں، تمھارے لیے اچھے اچھے کپڑے سلواتی ، بازار سے کھلونے لاتی ،تم مجھے بہت پیاری لگتی تھیں، میں نے کبھی آج تک تمھاری ماں سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ تم مجھے کتنی عزیز ہو۔

ذکر کرنے سے فائدہ بھی کیا ...... بیگم باتیں کرتے کرتے خاموش ہوگئیں ۔وہ کسی گہری سوچ میں گم نظر آرہی تھیں ۔

آٹھ سال کی سشما نے بیگم کا ہاتھ اپنے چھوٹے چھوٹے نرم نرم ہاتھوں میں لے لیا۔

بیگم نے سشما کو شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا ،اللہ ہماری نیتوں کے ساتھ ہے۔وہ بڑا کریم ہے۔

اس دن تمھارے رونے کی آوازیں مجھ سے برداشت نہ ہو سکیں ،ہوتیں بھی کیسے............؟

سشما نے بیگم کی گود میں سر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا منھ چھپا لیا۔اسے شرم آرہی تھی۔اس بات کو لے کر کچھ دن کھنچی کھنچی سی رہی۔

دھیرے دھیرے بیگم نے سشما کو اس کے کھانے پینے ،کھیلنے ، سونے ، پڑھنے وغیرہ سب کاموں کی ترتیب سمجھا دی۔ کچھ مہینے بعد سشما بھی بیگم سے بہت مانوس ہوگئی تھی۔کبھی کبھی یہیں سو رہتی۔

وہ روز اسکول جاتی اور واپسی پر بیگم کو اسکول کی ساری باتیں بتاتی ،جب کبھی کبھار اسکول سے اپنے گھر چلی جاتی تو بیگم کا دل گھبرانے لگتا، وہ اسے فوراً بلا بھیجتیں ۔ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں ۔سشما تھی ہی اتنی اچھی۔

وقت کا پرندہ پر لگا کر اڑتا رہا،صبح شام میں شام صبح میں تبدیل ہوتی رہی ۔سشما کی تعلیم جاری رہی ، انٹر کا امتحان دے چکی تھی۔رزلٹ آنے کا انتظار تھا۔انتظار کی مدت ختم ہوئی تو خوشیوں کی سوغات آئی۔اس نے امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر کے پورے اسکول کو ٹاپ کیا ،ہیڈ ماسٹر ، پرنسپل اور کلاس ٹیچر خوشی سے پھولے نہ سمائے ،یہ ان کے لیے فخر کی بات تھی کہ سشما نے پورے شہر میں اسکول کا نام روشن کیا۔لہٰذا وہ اس کے والدین سے ملنے کے خواہشمند تھے۔سشما نے بیگم کو بتایا تو انھوں نے انھیں اپنے گھر بلا لیا اور سشما کے ماتا پتا کو بھی بلا بھیجا۔

شیلا اور اس کے شوہر نے آتے ہی بیگم کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا''ہم دونوں آپ کے آبھاری ہیں کہ آپ نے سشما کو نیا جیون دیا۔ایشور آپ کا بھلا کرے ماتا پتا کے لیے اس سے بڑا سوبھاگیہ اور کیا ہوگا کہ ان کی سنتان کسی قابل بن جائے''۔

بیگم نے کہا یہ سب مالک کا کرم ہے ،میں کیا؟ میری بساط کیا؟ ہماری سشما ہے ہی اتنی ہونہار اس کی کامیابی میں کسی کا نہیں اس کی محنت کا ہاتھ ہے۔اللہ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔اچھا اب دیر نہ کرو۔آپ دونوں سشما کے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو کھنچوالو۔ اسکول سے ہیڈ ماسٹر اور منیجر صاحب آئے ہیں اخبار میں فوٹو چھپنا ہے۔

شیلا نے عاجزانہ انداز سے کہا، یہ ادھیکار تو بیگم آپ کا ہے۔ آپ ہی نے پڑھا لکھا کر اس کو قابل بنایا، پیدا کرنے والے سے بڑا پالنے والا ہوتا ہے۔

پھر وہی بات اس وقت ان باتوں کا موقع نہیں ہے جلدی کرو، انھیں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ باہمی کشمکش اور حجت کو دور کرتے ہوئے سشما نے فیصلہ کن انداز میں کہا''ماں ایک طرف تم اور ایک

طرف بیگم جی میرے ساتھ کھڑے ہوکر فوٹو کھنچوائیں گی۔

اگلے دن اخباروں میں اس فوٹو پر کافی چرچہ رہا کہ کتنی بھاگیہ شالی ہے یہ لڑکی

بیگم نے بھی اخبار دیکھا اور کہا۔ سشما آگے کی تیاری کرو زندگی کا سفر تو اب شروع ہوا ہے، تمھیں خدمتِ خلق کے لیے پوری توجہ اور لگن سے پڑھائی کرنی ہوگی، تم مضبوط بنوگی، تبھی کسی کا بھلا کرسکوگی ہمیں امید ہے کہ تم اپنے ساتھ ملک وملّت کا بھی خیال کروگی۔

بیگم کے مشورے پر سشما نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس میں داخلہ لیا اور پوری لگن و محنت سے یہ کورس بھی مکمل کرلیا۔ سشما اب ڈاکٹر بن چکی تھی اور شادی کے لائق بھی، بیگم کو اب اس کی شادی کی فکر ہوئی، وہ اس کے لیے ایسا لڑکا چاہتی تھیں جو ہر لحاظ سے اس کے اہل ہو۔ ایک دن انھوں نے سشما سے کہا اگر تمھاری نظر میں کوئی لڑکا ہو تو مجھے بتاؤ۔

اس نے مختصراً کہا۔ بیگم جی میری نظر میں کوئی نہیں ہے۔ بات ختم ہوگئی، کئی دن بعد بیگم نے شیلا کو بلوا کر کہا، سشما اب سیانی ہوگئی ہے، تعلیم بھی مکمل ہوچکی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اب اس کے ہاتھ پیلے کردیے جائیں۔ پڑھا لکھا لڑکا دیکھ کر اس کام کو انجام دے دینا چاہیے۔ تمھاری کیا رائے ہے؟

شیلا کے ذہن پر مایوسی کے بادل چھا گئے، آپ ٹھیک کہتی ہیں بیگم جی۔ یہ کام ہو جانا چاہیے۔ لیکن اس کے حساب سے پڑھا لکھا لڑکا میں کہاں تلاش کروں گی؟ یہ کام آپ اچھی طرح کرسکتی ہیں، سشما آپ کی بیٹی ہے جہاں چاہیں بیاہیں۔

بیگم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ شیلا کا جواب کیا ہوگا۔ لیکن ضابطے کے پیش نظر معلوم کرنا ضروری تھا۔ درحقیقت سشما ہے تو شیلا ہی کی اولاد، خونی رشتے بدلا نہیں کرتے۔

بہر حال اختیار مل جانے پر انھوں نے اپنے بیٹے ارباز کے ساتھ سشما کی شادی کے بارے میں سوچا۔ سشما سے معلوم کیا، جس کا اس نے خوشی خوشی ہاں میں جواب دیا۔ بیگم کو نہایت مسرت ہوئی کہ اس رشتے سے سشما اور اس کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں۔

سشما کی تعلیم وتربیت کیونکہ بیگم کے یہاں ہوئی تھی اسی لیے مزاج میں وہی نزاکت وہی نفاست اور رہن سہن کے طور طریقے بھی شاہانہ اور پسند بھی اعلیٰ ومعیاری ہوگئی تھی۔ ایسے گھرانے میں رہ کر اب معمولی گھرانے میں اس کی دال گلنا مشکل تھی۔

بیگم سب کچھ جانتی تھیں وہ سشما کی صلاحیتوں کو بھی پہچانتی تھیں۔ اگر اس کا پالا ناقدروں سے پڑ گیا تو اس پر جو گزرے گی سو گزرے گی بیگم کے لیے بھی اس سے بڑا صدمہ کوئی نہ ہوگا، انھوں نے اسے وہ قرب بخشا تھا، جو اپنی اولاد کو بھی نہ دے سکیں۔ بیگم کی آغوشِ محبت میں پل بڑھ کر ان کے سانچے میں ڈھلی ،نو جوان ، حسین، سگھڑ، پڑھی لکھی ہی نہیں سند یافتہ ڈاکٹر...... ارباز کے لیے اس سے زیادہ بہتر لڑکی ان کی نظر میں کوئی نہ تھی اور پھر انھیں اس سے محبت بھی تو تھی۔ کس دل سے دور کریں۔

سشما کے لیے بھی ارباز سے بہتر لڑکا ملنا مشکل تھا جو خوب رو، گبرو اور نوجوان ہوتے ہوئے ہم پیشہ اور ہم خیال بھی ہو۔ اسے جن باتوں کی امید بھی نہ تھی، وہ سب کچھ ملنے جارہا تھا۔ اس نے خواب میں بھی یہ سب کچھ نہیں دیکھا ہوگا۔ اس رشتے پر یقین ہوا تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ دل کی کلی کھل گئی ، اسے اپنی قسمت پر رشک ہورہا تھا کہ کیا قدرت ایسا بھی کرسکتی ہے؟ اسے دنیا میں ہی جنت نظر آنے لگی ، وہ اپنی زندگی کو خوش گوار ہوا کے جھونکوں کے درمیان پھلتا پھولتا اور جھولتا محسوس کرنے لگی۔ پہلی مرتبہ اسے ارباز کی آمد کا شدت سے انتظار تھا۔

سال بھر میں ارباز صرف پندرہ دن کے لیے ہندوستان آیا کرتا تھا، اب اس کے آنے کے دن بھی قریب تھے۔ بیگم نے شادی کی تیاریاں دھوم دھام سے شروع کرادیں۔ زیور، بری ، چوڑی ، جوڑے ، گھوڑے ، کھانے پینے کے تمام انتظامات انھیں کو تو کرنے تھے، وہ بیٹے اور بیٹی دو طرفہ رشتوں کو نبھانے والی اکیلی شخصیت تھیں ۔نواب صاحب ان کی مدد کیا کرتے ۔سشما بھی بیگم کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔

وہ ہمیشہ پڑھائی اور گھر کے کاموں میں ہی مصروف رہا کرتی

تھی، اپنے حلیہ اور فیشن کی جانب دھیان دینے کا نہ تو شوق تھا، نہ ہی ضرورت، لیکن اب کیونکہ وہ ارباز خان کی جیون ساتھی بننے جارہی تھی۔ لہٰذا اس نے اپنی جانب دھیان دینا بھی ضروری سمجھا، آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سراپا کو نہارتی اور کبھی کبھی دیوار سے ارباز کی فوٹو اتار کر اپنے ساتھ آئینے میں دیکھتی، اور یہ بھی دیکھتی کہ کوئی دیکھتا نہ ہو، شرمیلی بہت تھی، خوبصورتی اور حیا کی آمیزش اس پرمسرت کے جذبات اسے سراپا نور بنا دیتے اس کی سادگی بھی پرکاری رکھتی تھی۔ سج سنور کے کیا عالم ہوگا؟

ارباز بہت سنجیدہ اور کھلے ذہن کا مالک تھا۔ بچپن کی تربیت اور ماں باپ کی دعاؤں کے زیر سایہ اس کی سیرت وصورت کے حسن میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ محنت، لگن، کام کرنے کی جستجو اور ایمانداری نے اس کی شخصیت کو مزید پروقار بنا دیا تھا، آزاد اور کھلے ماحول میں تنہا رہتے ہوئے بھی اس نے اپنے تہذیبی دائروں سے باہر آنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور پرفتن زمانے کی بے راہ روی سے خود کو محفوظ رکھا، یہ بات اس کی پاک بازی اور پاک دامانی کا کھلا ثبوت ہے کہ اس نے ہمسفر کے انتخاب میں ماں کے فیصلے کو فوقیت دی۔ اگرچہ سشما کے بارے میں سب کچھ سنتا رہتا تھا، لیکن ہمسفر کے روپ میں دیکھنے اور پانے کے لیے اس کے دل میں بھی امنگیں پیدا ہو چلی تھیں۔ حالانکہ اس نے سشما کو ہمسفر بنانے کی نظر سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے تو صرف ماں کی پسند پر بھروسہ تھا۔

ماہ دسمبر کے پہلے ہفتے میں ہی ارباز نے ساری خریداری مکمل کر لی گھر والوں کے لیے ہر سال وہ قیمتی تحائف لے کر آتا تھا، اس دستور کو قائم رکھتے ہوئے مزید خریداری شادی سے متعلق بھی مکمل کر لی۔ 16 دسمبر کو اس کی فلائٹ تھی، شادی کی تاریخ بھی طے ہو چکی تھی، بیگم نے تمام انتظامات نہایت اہتمام کے ساتھ پورے کرا لیے تھے اب تو بس اس کی آمد کا انتظار تھا۔ کب یہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوں گی اور بیٹے کے سر سہرا سجے گا۔

آخر کار انتظار کی مدت ختم ہوئی، ارباز کی آمد بالکل ایسی محسوس ہوئی گویا صبح کو سورج نمودار ہوا ہو، اس کے آتے ہی گھر کی رونق بڑھ گئی، آج گھر کے در و دیوار بھی مسکرا رہے تھے، ہر چیز جگ مگ جگ مگ ہو رہی تھی، ہر طرف ہلچل اور مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا، کئی دن پہلے سے محلے پڑوس کی لڑکیوں نے گانا بجانا اور مہندی لگانا شروع کر دیا تھا، آخر کار شادی کا دن بھی آ گیا، چچی جان، پھوپھی جان، خالہ جان، ممانی جان ان کے بچے پڑوسی احباب وغیرہ سبھی کو ارباز کی شادی کا بے صبری سے انتظار تھا۔ سب نے جی بھر کے ارمان نکالے، ارباز بہت سنجیدہ اور خاموش طبع تھا، اسے ان تمام باتوں میں نہ تو دلچسپی تھی نہ کوئی ناگواری، شادی کی رسموں سے متعلق بھی اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جس کا جو جی چاہا وہ کیا۔ پنڈت جی نے پھیرے لگوائے تو ماں نے قاضی جی سے نکاح پڑھوایا۔ چھوارے تقسیم ہوئے۔ مبارکبادیں دی جا رہی تھیں، خوشی کے شادیانے بج رہے تھے، چار سُو خوشی کا ماحول تھا۔ سشما دلہن کے سرخ جوڑے میں ملبوس کسی حور یا پری سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

اس کے لیے یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ جس گھر میں تعلیم و تربیت کی غرض سے رہی اور اس کی ماں نے جہاں کسی زمانے میں ملازمت کی تھی، اسی گھر میں بہو بن کر داخل ہو رہی ہے، آج اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا بس چلتا تو آسمان سے تارے توڑ لاتی لیکن کون جانے کہ اس گھر کو کسی کی نظر لگ جائے گی۔ خوشیوں کا قلع قمع ہو جائے گا، خواب چکنا چور ہو جائیں گے، سب کچھ تیرہ تین ہو جائے گا، آن کی آن میں بسا بسایا گھر تباہ و برباد ہو جائے گا۔ محبتیں تار تار ہو جائیں گی، صداقتیں دم توڑ دیں گی، جذبات کچل دیے جائیں گے، امنگوں کا جنازہ نکال دیا جائے گا۔ ایک ہی ملک میں بسنے والے دو خانوادوں کے درمیان ایک ایسی حد فاصل قائم کر دی جائے گی جسے پار کرنا قطعی ناممکن تھا۔

محبت اور جذبات کی دنیا میں اس طاقت کی پہچان کسی کو نہ ہوئی۔

❒❖❒

Dr. Zaiba Naaz
Nai Basti, Bara Shah Safa,
Mooradabad- 244001 (U.P)
E-mail:dr.zaibanaaz@gmail.com

تو ہم سفر

نیلوفر سعدیہ

''سبین ذرا برتن دھو دینا بیٹی۔'' ریحانہ نے اپنی بیٹی سبین کو آواز دی، سبین شدید غصّے سے کچن میں آئی اور کہا۔''امی آپ جزا سے کہیں میں نہیں دھونے والی کوئی برتن ورتن، یہ کام تو جزا کرتی تھی، گزشتہ ایک سال سے میں اکیلی اس گھر کے کام کر رہی ہوں اور وہ اس وہیل چیئر پر آرام سے بیٹھی رہتی ہے۔''

ریحانہ، سبین کی بات پر گہری سانس لے کر بولی۔

''اب کیا کر سکتے ہیں بیٹا، وہ پہلے ہی کیا کم بوجھ تھی، کم از کم پہلے اس سے گھر کے کام تو کروا سکتے تھے اب تو وہ بھی نہیں کر سکتے معذور جو ہو کر بیٹھی ہے، مفت کی روٹی دینے کے علاوہ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔''جزا ڈرائنگ روم میں اپنی وہیل چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی ان دونوں کی تمام باتیں جزا کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ گزشتہ ایک سال سے وہ ایسے تکلیف دہ جملے سنتی آ رہی تھی۔

سبین اس کی خالہ زاد بہن تھی اور جزا کی امی کی وفات اس کی پیدائش کے وقت ہی ہو چکی تھی اور اس کے ابا اس ننھی سی گڑیا کو سبین کے والدین ریحانہ اور جمال خان کو سونپ کر یہ کہہ کر گئے تھے کہ وہ کچھ ماہ بعد آ کر اسے لے کر جائیں گے، لیکن اس دن کے بعد وہ کبھی نہیں آئے۔ اب وہ پچیس برس کی ہو چکی تھی، نہ جانے کتنی ذلت، طنز اور زہریلے لہجے میں وہ بڑی ہوئی تھی۔ ایک بوجھ اور ملازم سے بڑھ کر اسے اور کچھ نہیں سمجھا گیا تھا۔ ایک سال قبل کالج سے گھر آتے وقت جزا ایک کار ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئی جس کے سبب اس کے دونوں پیر پیرالائیز ہو گئے اور اس وقت سے آج تک وہ ٹھیک نہیں ہو پائی، اور نہ ان لوگوں نے اس کا علاج کروایا۔ اس حادثے کے بعد تو وہ انھیں زہر لگنے لگی تھی۔ وہ اس سے پیچھا چھڑانے کے بہانے ڈھونڈتے۔ رشتے دار اور پڑوس کی خواتین اس کے متعلق ہمیشہ یہ سوچتی کہ اتنی پیاری اور حسین لڑکی ہے، البتہ چل نہیں سکتی۔ اس نے اپنی تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی کیونکہ وہ کالج نہیں جا سکتی تھی۔ اب وہ ان چیزوں کی عادی ہو چکی تھی اور جس حال میں وہ تھی اس حال میں اللہ کا شکر ادا کر کے رہنا سیکھ گئی تھی۔

فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد جب افق پر سورج کی کرن کا ہلکا نارنجی رنگ نظر آیا تب اس کا دل کیا کہ وہ کھلی ہوا میں باہر نکلے۔ وہ ایک پشمینہ شال کندھوں پر اوڑھ کر وہیل چیئر کو چلاتے ہوئے گھر کے باہر آئی صبح کے وقت باہر کا منظر قابل دید تھا سڑک پر کوئی گاڑی نہیں تھی ہلکی تازہ ہوا چل رہی تھی سڑک کے کنارے لگے ہوئے خوبصورت پیڑوں کے پتے ہلکی ہوا میں رقص کر رہے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سے ماحول اور بھی خوش گوار ہو رہا تھا۔ چند لوگ مارننگ واک کر رہے تھے ایک جگہ رک کر وہ بس قدرت کا منظر دیکھ رہی تھی۔ سامنے سے ایک ستر سالہ بزرگ شخص واک کرتے ہوئے آ رہے تھے جزا پر نظر پڑی تو کچھ دیر حیرانی سے اسے دیکھتے رہے پھر اس کی وہیل چیئر کے قریب آ کر رک گئے۔ جزا انھیں دیکھ کر کنفیوز ہوئی اور اگلے ہی پل سلام کیا۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔''انھوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ اور کہا۔ بیٹا تمھارا چہرہ ہو بہو کسی سے ملتا ہے۔

جزا حیران ہوئی۔

''جی میں تو بس اپنی امی کی طرح لگتی ہوں۔'' وہ چند لمحے سوچ میں پڑ گئے۔

''کیا تمھاری امی کا نام نصرت ہے۔؟'' جزا دنگ رہ گئی۔

''آ۔۔۔۔۔آپ کو کیسے پتا۔'' جزا کے منہ سے نکلی اس بات نے یہ تصدیق کردی کہ وہ شخص بالکل درست کہہ رہے ہیں اور وہ بے انتہا خوش ہوئے۔

''تب ہی میں سوچوں کہ یہ لڑکی تو بالکل نصرت کی ہو بہو ہے بس تمھاری آنکھیں بھوری ہیں اور اس کی سیاہ تھی۔ بہت وقت ہوگیا اسے دیکھے کیسی ہے وہ؟ اور کہاں ہے۔''؟

جزا ایک ٹک اس شخص کو دیکھنے لگی۔

''میری پیدائش کے وقت ہی ان کی وفات ہوگئی۔ جزا کی آنکھوں میں ضبط کے باوجود آنسوں تھے اور اس شخص کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

''یہ سب کب ہوا اور کیسے۔۔۔''

''اس بات کو پچیس سال ہوگئے میرے ابا بھی مجھے میرے آنٹی انکل کے پاس تب چھوڑ گئے جب مجھے ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی میں نے اپنے ابا کو آج تک نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی دیکھنا چاہوں گی۔''

کافی دیر دونوں کے درمیان خاموشی طاری رہی پھر اس نے کہا۔

''آپ میری امی کو کیسے جانتے ہیں۔؟''

''میرا نام انور مقصود ہے۔۔۔۔۔نصرت میری بیٹی جیسی تھی۔ مجھے بابا کہا کرتی تھی میں نے اس کا بچپن دیکھا اسے بڑے ہوتے دیکھا وہ میری بیٹی جبین کی بچپن کی سہیلی تھی۔ شادی کے بعد اسے کبھی نہیں دیکھا۔ پر کیا پتا تھا کہ وہ اب نہیں ہے۔؟''

ان کی آواز بجھی بجھی سی ہوگئی۔ کچھ دیر بعد انھوں نے جزا کے پیروں کی سمت دیکھا، وہیل چیئر دیکھی اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''تمھارے ساتھ یہ کیسے ہوا بیٹا۔''

وہ بہ مشکل مسکرائی اور آنسوں ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا جس کے سبب میرے پیر پیرالائیز ہوگئے۔ گزشتہ ایک سال سے میں وہیل چیئر پر ہوں۔''

دونوں کی گفتگو جاری تھی تب ہی دور سے جاگنگ سوٹ میں ملبوس لمبے قد چوڑے شانے والا ایک وجیہہ نوجوان دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ انور مقصود کو دیکھ کر وہ رک گیا پھر اس نے جزا کی سمت دیکھا اور اس کی وہیل چیئر دیکھی۔ وہیل چیئر پر بیٹھی جزا کو دیکھ وہ حساس ہونے لگا۔ پھر دوڑتا ہوا ان دونوں کے قریب آیا۔

''آپ یہیں ہیں نانو مجھے لگا آپ دور نکل گئے ہوں گے۔''

''یہ دیکھو یہ ہے میرا نواسا جبین کا اکلوتا بیٹا، روشان۔''

انھوں نے روشان کا تعارف کرایا، جبکہ روشان حیرانی سے ان دونوں کی سمت دیکھ رہا تھا۔

''کیا آپ انھیں جانتے ہیں نانو۔؟'' روشان نے سوال کیا

''یہ لڑکی تمھاری امی کی سہیلی "نصرت" کی بیٹی ہے۔''

روشان دم بخود ہوکر جزا کو دیکھنے لگا۔

''وہی نصرت آنٹی جن کو امی آج بھی یاد کرتی ہیں۔؟'' روشان نے پوچھا، انور مقصود نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پر افسوس کہ اب وہ ہمارے بیچ نہیں ہے۔؟'' انور مقصود کے جملے نے روشان کے سر پر جیسے دھماکہ سا کیا ہو۔

''کک۔۔۔۔۔کیا۔۔۔۔۔پر یہ کب ہوا نانو۔۔ اور ہم اس بات سے کیسے انجان رہے۔''

''اس بات کو پچیس سال گزر گئے، بیٹی کی پیدائش کے وقت ہی نصرت۔۔۔۔'' وہ چپ ہوگئے ''شاید یہ تب ہوا جب ہم لوگ یہاں نہیں تھے۔''

''کیا آپ لوگ کہیں اور رہ رہے تھے۔؟'' جزا نے کہا

''ہاں کچھ سال ہم لوگ دوسرے شہر میں شفٹ ہوگئے تھے اب واپس یہاں آگئے ہیں۔ میں اپنی بیٹی جبین، اس کے شوہر اقبال اور نواسے کے ساتھ رہتا ہوں، میرا کوئی بیٹا نہیں ہے، البتہ اس بات کا کوئی افسوس نہیں ہے۔'' وہ مسکرائے، ان کی بات سن کر وہ بھی مسکرائی۔

''بیٹی تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔''

''میرا نام جزا ہے۔''

''لگتا ہے تم پہلی دفعہ باہر آئی ہو میں اور نانو روز جاگنگ کے لیے یہاں سے گزرتے ہیں پر آج تک تمھیں دیکھا نہیں۔'' روشان نے کہا

''جی۔۔میں اکثر گھر میں ہی رہتی ہوں، یہیں پاس میں میرے انکل آنٹی کا گھر ہے میں انہی کے ساتھ رہتی ہوں۔۔۔اب مجھے جانا چاہیے کافی دیر ہوگئی ہے۔''

وہ اپنی وھیل چیئر کو ہاتھوں سے چلاتے ہوئے وہاں سے جانے لگی تب روشان نے اس کی وھیل چیئر پیچھے سے پکڑ کر کہا۔''میں مدد کرتا ہوں۔''

''جی نہیں آپ زحمت نہ کریں میں خود چلی جاؤں گی۔'' وہ اس کی بات نہ مان کر اس کی وہیل چیئر کو سہارا دیتے ہوئے لے گیا، انور مقصود انھیں دیکھ کر مسکرائے بغیر رہ نہیں پائے۔جزا نے گھر کا راستہ بتایا اور روشان اسے گھر تک چھوڑ آیا۔

دیر رات ڈرائنگ روم میں جمال خان اور ریحانہ کی بات چیت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، جزا کا کمرہ ڈرائنگ روم کے ٹھیک سامنے تھا، اسے کمرے کے اندر ان کی گفتگو کی آوازیں اکثر سنائی دیتی۔وہ کبھی اس کی شادی کسی بزرگ سے کرنے کا ذکر کرتے کبھی اسے گھر سے نکال باہر کرنے کی باتیں کرتے کبھی اسے بوجھ اور معذور کہتے۔اکثر جزا کی سماعت سے ایسی باتیں ٹکراتی رہتیں۔ایک دن یا ایک رات بھی ایسی نہیں گزرتی جو جمال خان اور ریحانہ کی کڑوی باتیں اس کی سماعت سے نہ ٹکراتیں۔ایک شام جزا اپنی وہیل چیئر لے کر باہر آگئی وہیل چیئر چلاتے ہوئے وہ خاصا دور آگئی تھی۔وہ ریحانہ اور جمال کی باتوں میں غرق تھی اس لیے اسے خود علم نہیں ہوا کہ وہ کتنی دور نکل آئی ہے، ایک جگہ وہ بیچ راہ میں رک گئی، پیچھے سے ایک کار کافی دیر سے ہارن بجا رہی تھی تاکہ وہ راستے سے ہٹے لیکن وہ جیسے برف کی مانند سرد سی وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔

''جزا۔۔۔تم یہاں کیا کر رہی ہو۔؟'' اس جانی پہچانی آواز کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

روشان پیدل وہاں سے گزر رہا تھا تب جزا پر نگاہ پڑی تو وہ اسے اس وقت گھر سے اتنی دور دیکھ کر حیران رہ گیا البتہ اس نے روشان کی آواز بھی نہیں سنی روشان نے اس کے وہیل چیئر کو پیچھے سے پکڑ کر بیچ سڑک سے ہٹا کر سڑک کی سائیڈ میں لا کر کہا۔

''جزا تم ٹھیک ہو؟'' اس کے وہیل چیئر ہٹانے کے سبب وہ جیسے ہوش میں آئی اور ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگی، روشان اس کی وھیل چیئر کے ٹھیک سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور کہا۔

''کیا ہو گیا ہے تمھیں وہ کار میں بیٹھا شخص کب سے ہارن بجا رہا تھا لیکن تم نے سنا ہی نہیں، اور تم اس وقت گھر سے اتنی دور وہ بھی تنہا کیسے آگئی۔؟''

جزا خود حیران تھی اور ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ وہ کدھر آگئی ہے۔

''وہ۔۔۔۔مم۔۔۔میں بس کھلی ہوا میں باہر آئی تھی کافی دور آگئی شاید۔''

''شاید؟'' وہ مسکرا کر بولا۔

''نصرت آنٹی کی یاد آرہی ہوگی۔'' جزا چپ چاپ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو دیکھ رہی تھی جو ایک دوسرے میں الجھ رہی تھیں۔

''نانو نے مجھے کل سب بتایا کہ تمھارے ساتھ یہ حادثہ کیسے ہوا اور تمھارے ابّا کے تعلق سے بھی سب بتایا۔۔۔میری امی بھی نصرت آنٹی کے بارے میں جان کر بہت روئی، انھیں یقین نہیں آرہا تھا کہ نانو سچ کہہ رہے تھے، وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔''

جزا بس اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''کچھ بولو جزا میں جانتا ہوں تمھارے دل میں بہت کچھ ہے جو تم خود سے بھی چھپا رہی ہو۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''میں کسی پر بوجھ بن کر نہیں جینا چاہتی، پر میں جی رہی ہوں کیوں کہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔'' اس کے دو جملوں نے روشان کو سرد کر دیا۔گہری سانس لے کر اس نے کہا۔

''کیا کچھ ہوا ہے جزا۔۔۔؟تم ٹھیک تو ہو؟تمھاری باتوں سے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم کسی الجھن میں ہو۔''

جزا کچھ دیر خاموش رہی اور کہا۔

''بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کے خونی رشتے ہی آپ کو اپنی راہ کا سب سے بڑا کانٹا سمجھتے ہیں، اس وقت انسان کو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کرے، کہاں جائے۔۔۔اپنی زندگی کو ختم کرنا اسے ہر مسئلے

کا واحد حل نظر آتا ہے کیونکہ اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں بچتا لیکن دل میں اللہ کا خوف اس عمل کو، اس گناہ عظیم کو کرنے سے روکتا ہے۔''

روشان حیرت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی باتیں سن کر وہ سکتے کے عالم میں تھا۔

''اب میں چلتی ہوں بہت دیر ہوگئی ہے۔'' یہ سنتے ہی روشان اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی وہیل چیئر پیچھے سے پکڑ کر بولا۔ ''میں گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔''

''آپ زحمت نہ کریں میں خود چلی جاؤں گی۔''

روشان نے اس کی بات کو نظر انداز کیا اور اسے گھر تک چھوڑ آیا۔ اس کے بعد وہ دو تین بار جزا سے ایسے ہی چلتے پھرتے ملا۔۔۔ اس کا معصوم چہرہ اس کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ ایک دن وہ اپنی جاب سے گھر آیا تو اس کی امی اسے دیکھ کر بولی۔ ''آ گئے تم روشان میں کھانا لگا ہی رہی تھی چلو بیٹھ جاؤ۔'' وہ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھانے بیٹھ گیا، البتہ اس کا دل بھاری ہو رہا تھا اس سے ایک نوالہ بھی کھایا نہیں گیا۔ جزا کی بڑی بڑی باتیں اور معصوم چہرہ اس کے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ ''کیا بات ہے روشان سب ٹھیک ہے؟'' اقبال نے کہا۔

''جی ابّو۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔''

''لگ تو نہیں رہا۔'' روشان کا چہرہ بجھا بجھا سا ہونے لگا تھا جو صاف ظاہر کر رہا تھا کہ کچھ تو ہے جو وہ کہہ نہیں پا رہا۔ آخر کو اس نے ہمت جٹا کر انھیں وہ سب بتایا کہ وہ اس دن جزا سے ملا اور ان دونوں کے درمیان ہوئی وہ تمام باتیں ان تینوں سے کہی۔ اس کی بات سنتے ہی کچھ دیر خاموشی طاری ہوگئی پھر انور مقصود نے کہا۔ ''ضرور وہ کسی ذہنی تناؤ میں مبتلا ہے۔ جبین اگر تم اس بچی کو دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی کہ اتنی خوبصورت لڑکی چل نہیں سکتی اس کے پیر اگر ٹھیک ہوتے تو ڈھونڈنے سے بھی اس میں کوئی کمی نہ ملتی، وہ بالکل نصرت جیسی لگتی ہے۔''

کچھ دیر سب کے درمیان خاموشی چھائی رہی، نصرت کی یاد کے سبب جبین کی آنکھیں بھر آئیں۔

''کیوں نہ اسے ہم اپنے گھر لے کر آئیں۔'' جبین کے یہ کہتے ہی روشان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھی۔

اور وہ اقبال کو دیکھنے لگا۔

''جبین۔۔۔۔ لوگ کیا کہیں گے نہ جانے کس لڑکی کو گھر میں رکھا ہے اگر اسے اس گھر میں لے کر آنا ہی ہے تو پورے حق سے لے کر آؤ حلال طریقے سے لے کر آؤ، تاکہ لوگوں کو کچھ بکواس کہنے کا موقع ہی نہ ملے۔'' اقبال کے یہ جملے سن کر جبین اور انور مقصود حیرانی سے روشان کو دیکھ رہے تھے اور روشان حیرت سے آنکھیں پھاڑے سب کو دیکھنے لگا وہ اس بات کا مطلب سمجھ نہیں پایا۔ البتہ جبین اور انور مقصود روشان کو مسکرا کر دیکھنے لگے۔

''اگر یہ لڑکا راضی ہو تو ہم لوگ جا کر اس بچی کا ہاتھ مانگ لیں گے مسئلہ ختم، ویسے بھی روشان اچھی جاب کرتا ہے شادی کی عمر ہے۔۔۔'' اقبال کے یہ کہتے ہی جبین کی خوشی قابل دید تھی انور مقصود بھی مسکرانے لگے۔

''روشان بولو نہ بیٹا تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نہ؟'' جبین نے پوچھا۔ روشان نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ ''مجھے اس رشتے سے کوئی اعتراض نہیں ہے امی، ایک دفعہ آپ ہی سوچیں آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں کہ وہ چل نہیں سکتی باقی لڑکیوں کی طرح گھریلو کام نہیں کر سکتی۔''

''یہ بات اس نے بالکل ٹھیک کی ہے جبین اکثر ساسوں کو اپنی چلتی پھرتی بہوؤں سے شکایات ہوتیں ہیں کہ وہ گھر کے کام نہیں کرتیں۔ یہ بیچاری لڑکی تو معذور ہے تمھیں مستقبل میں اس سے اگر کوئی پریشانی ہوسکتی ہو تو ابھی بتا دو یہ بعد میں شکایات کرنے سے بہتر ہے۔'' اقبال نے سمجھاتے ہوئے کہا تو جبین بولی ''ہم بہو لانے کی بات کر رہے ہیں ملازمہ نہیں اللہ کے احسان سے ہمارے گھر میں دو ملازمہ ہیں مجھے جزا کو اپنی بہو بنانے سے کوئی اعتراض نہیں ہے اگر میرا بیٹا اسے اپنی شریک حیات بنانا چاہتا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہوگا۔'' روشان کو اپنی امی سے ایسی ہی توقع تھی وہ بے حد خوش تھا۔ چند دنوں بعد وہ چاروں جزا کے گھر اس کا ہاتھ مانگنے گئے۔ لیکن وہاں ان لوگوں کے ہوش باختہ ہوگئے۔ ریحانہ اور جمال سے پتا چلا کہ جزا گھر سے چلی گئی ہے۔ روشان بھڑک اٹھا۔

''جھوٹ کہہ رہے ہیں آپ لوگ ضرور آپ لوگوں نے کچھ کیا ہوگا، اسے گھر سے نکال دیا ہوگا۔'' انور مقصود اور روشان کے والدین

روشان کو سمجھانے لگے۔

''وہ خود جانا چاہتی تھی اس لیے ہم نے اسے جانے دیا اگر اسے روکتے تو اسے زبردستی گھر میں قید رکھنے کا الزام لگتا، اس کی مرضی تھی وہ کوئی بچی نہیں ہے اپنے فیصلے لے سکتی ہے۔'' ریحانہ نے کہا تو روشان نے غصّے میں بھڑک کر کہا۔

''یہ دنیا اس جیسی معصوم کا کیا حشر کر سکتی ہے یہ سوچا ہے آپ نے، آپ لوگ تو چاہتے ہی ہوں گے کہ وہ چلی جائے۔'' روشان کا غصّہ آسمان پر تھا اور آنکھوں میں نمی تھی۔ ''کس وقت گئی تھی وہ۔'' انور مقصود نے پوچھا تو ریحانہ نے کہا۔ ''دو دن پہلے گئی تھی اور اس کی کوئی کالج کی دوست نے اسے کال کیا تھا وہ جزا کو کسی جاب کے لیے بلا رہی تھی۔ اب مجھے یہ نہیں پتا کہ وہ اسی شہر میں ہے یا کسی اور شہر میں۔''روشان نے سر پکڑ لیا۔ وہ لوگ اسے سمجھا کر گھر لے آئے۔ وہ اسے شہر بھر میں تلاشنے لگا لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔ اسے ڈھونڈتے ہوئے روشان کو یہ احساس ہوا کہ جزا کے لیے اس کی ہمدردی نے اب محبت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ وہ اسے دل سے قبول کرنا چاہتا تھا لیکن ایسا ہونے کے پہلے وہ چلی گئی تھی۔

ایک سال گزر چکا تھا روشان کی زندگی سے جیسے مسکراہٹ چلی گئی تھی۔ ہر دن بہت خاموشی سے گزر جاتا جبین بھی روشان کو اس حال میں دیکھ کر پریشان تھی وہ بھی جزا کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھی، روشان کے لیے کئی رشتے آرہے تھے لیکن وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔۔۔شام کے وقت تھکا ہوا وہ آفس سے گھر آیا کپڑے تبدیل کیے سرمئی رنگ کی لمبے آستین والی ٹی شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس ہر روز کی مانند کھلی ہوا میں واک کرنے نکل گیا رات کے کوئی آٹھ بجے کا وقت تھا وہ اپنے پینٹ کی دونوں جیب میں ہاتھ ڈالے ہوئے دھیمی رفتار میں چلتا ہوا جا رہا تھا۔ اچانک اس کے قدم وہیں جم گئے، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اسے اس کے پیروں پر کھڑا ہوا دیکھ کر دم بخود تھا۔ وہ وہی تھی، وہ جزا تھی اور بالکل صحیح سالم اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی تھی عنابی رنگ کے سوٹ میں ملبوس سیاہ رنگ کی پشمینہ شال شانوں پر اوڑھے وہ بے انتہا حسین لگ رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر ایک آئس کریم والے سے آئس کریم خرید رہی تھی اور اس کے قریب ہی ایک بے بی اسٹرالر (baby stroller) تھا جس میں کچھ چار ماہ کی بچی تھی۔ اس بچی کے رونے کے سبب جزا نے آئس کریم خریدنا چھوڑ کر اس بچی کو گود میں لے لیا اور اسے چپ کرانے لگی۔ اور تب ہی جزا کی نظر روشان پر پڑی وہ حیرانی اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں اسے دیکھنے لگی۔ اور اس کے گود میں بچی دیکھ کر روشان پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا اور اس بچی کو گود میں لیے وہ روشان کے بالکل روبرو آ کر رکی اس کے چہرے پر مسکان تھی، روشان اس بچی کو دیکھ کر ہکا بکا تھا۔

''شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔'' وہ مسکرائی

''میں تمھیں کیسے بھول سکتا ہوں جزا، میں تمھیں کبھی نہیں بھول سکتا میں نے تمھیں کہاں، کہاں نہیں ڈھونڈا، کہاں چلی گئی تھی تم۔''

''آپ مجھے ڈھونڈ رہے تھے؟ کیوں؟۔'' وہ اس کے سوال پر تھکی ہوئی مسکان سے اس بچی کو دیکھتا ہے۔ اور نفی میں سر ہلا کر کہا۔

''کچھ نہیں۔۔۔تم کہو کیسی ہو؟ ماشاءاللہ تم چل پا رہی ہو، بہت خوشی ہوئی تمھیں دیکھ کر لگتا ہے تمھارے شوہر نے تمھارا صحیح ٹریٹمینٹ کروایا ہے۔''

''شوہر؟ جی نہیں میں نے ابھی شادی نہیں کی ہے۔'' یہ سنتے ہی روشان کی حیرانی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ ''تو یہ بچی تمھاری نہیں ہے؟'' وہ مسکرائی ''جی نہیں یہ میری فرینڈ امرین کی بیٹی ہے۔'' روشان کی جان میں جان آئی اور اس نے دل میں شکر الٰہی کیا۔

''تمھیں پتا بھی ہے میں نے تمھیں کتنا ڈھونڈا، لیکن تم خدا جانے کہاں چلی گئی تھی۔' جزا کو آواز دیتے ہوئے امرین وہاں آئی اور اپنی بچی کو گود میں لے کر روشان کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ جزا نے روشان اور امرین کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔'یہی ہے میری کالج فرینڈ، انکل آنٹی کے ساتھ تھی تو اذیت کا شکار ہوتی رہی ایک دن امرین کی کال آئی اس نے مجھے جاب دلوائی اور مجھے لینے گھر تک آئی یہ بھی تنہا تھی کیونکہ اس کے شوہر نے اسے تب طلاق دیا جب یہ پریگنینٹ تھی تب سے میں امرین کے ساتھ ہی رہ رہی تھی

اور خود جاب کر کے میں نے اپنا ٹریٹمینٹ بھی کروایا اللہ کے کرم سے اب میں چل سکتی ہوں۔ روشان غور سے سننے لگا۔ ''تم اگر ابھی مصروف نہ ہو تو امی سے ملنے چلو گی وہ بہت یاد کرتیں ہیں تمھیں۔

''جی ان شاءاللہ میں کل ضرور آؤں گی، اب میں یہیں رہ رہی ہوں امرین کے ساتھ۔ آپ کہاں رہتے ہیں؟''

''میں یہیں پاس میں رہتا ہوں یہ اگلے موڑ پر اقبال منزل میں۔'' وہ مسکرائی اور اللہ حافظ کہہ کر امرین کے ساتھ چلی گئی روشان کی خوشی کی انتہا نہ تھی لیکن دل میں ایک سوال بھی کھائے جا رہا تھا کہ اگر وہ اس سے شادی کے لیے پوچھے گا تو کہیں اسے یہ نہ لگے کہ اب جب وہ چل سکتی ہے اور خود مختار ہوگئی ہے اس لیے وہ شادی کے لیے پوچھ رہا ہے۔ وہ گھر آکر سب کو جزا کے واپس آنے کی خبر سناتا ہے پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ساتھ ہی اس نے اپنے ذہن میں اٹھتے سوال کا ذکر اپنی ماں سے کیا تو اس بات پر تو وہ بھی اتفاق کرتی تھیں۔ اور کہا ''جزا ایسا سوچ سکتی ہے روشان۔۔۔ کہ جب وہ بے سہارا تھی تب کسی نے شادی کے لیے نہیں پوچھا اور اب جب وہ ٹھیک ہوگئی ہے تب اسے شادی کے لیے پوچھیں گے تو وہ ضرور یہ سوچے گی البتہ حقیقت تو یہ ہے ہم تو اسے پہلے سے ہی بہو مان بیٹھے تھے۔'' جبین خود پریشان تھی، اسی الجھن میں روشان رات بھر جاگتا رہا۔ اگلے دن ڈور بیل بجنے پر روشان نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے جامنی رنگ کے سوٹ میں ملبوس بے تحاشا حسین لگ رہی تھی۔

''السلام علیکم'' اس نے مسکرا کر سلام کیا۔ روشان نے وعلیکم السلام کہا اور اسے اندر بلایا اپنی امی کو پکارنے لگا جبین کچن سے باہر آئی تو جزا کو دیکھ کر دو پل کو رک سی گئی کیونکہ نصرت جب جوان تھی تو بالکل ایسی ہی دکھتی تھی۔ جزا نے سلام کیا تو جبین نے اسے گلے لگا کر جواب دیا۔

''تم تو بالکل اپنی امی پر گئی ہو تمھاری عمر میں وہ بھی ایسی ہی تھی۔'' جزا مسکرائی اور انور مقصود اور اقبال سے بھی ملی۔ کافی دیر بات چیت کے بعد جبین نے اسے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو بیٹی ایک بات کہنی تھی تم سے۔۔۔ میں روشان کے لیے۔۔۔ تمھارا ہاتھ مانگتی ہوں۔۔۔۔ روشان جاب کرتا ہے خاصا کماتا ہے، تمھارے فیصلے کرنے کے لیے تمھارے والدین ہوتے تو ہم ان سے ہی یہ بات کرتے البتہ یہ فیصلہ صرف تمھارا ہے۔'' وہ چپ رہی اور ایک نظر روشان کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا، وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کہا۔ ''جی آنٹی۔۔۔ میں تیار ہوں۔''

روشان کو اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا پر وہ سب کے سامنے ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ باقی سب بھی بے حد خوش تھے، جبین نے رات کے کھانے کے بعد روشان کو اسے گھر چھوڑ کر آنے کو کہا وہ لوگ پیدل ہی جانے لگے کیونکہ وہ زیادہ دور نہیں رہتی تھی کافی دیر دونوں کے درمیان خاموشی رہی وہ صرف چلتے جا رہے تھے۔ روشان نے ہمت جٹا کر کہا۔ ''تمھیں مجھ سے شادی سے کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا؟'' جزا نظریں اٹھائے بغیر مسکرائی اور کہا۔

''جس شخص نے میرا ہاتھ تب تھامنا چاہا جب سب نے چھوڑ دیا تھا اس شخص سے نکاح کرنے سے مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔'' روشان چلتے ہوئے رک گیا اسے دیکھ وہ بھی رک گئی اور اب اس کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں آنے کے بعد میں سب سے پہلے ریحانہ آنٹی کے گھر گئی تھی بے شک وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے لیکن مجھے لگا ایک سال بعد اگر اس شہر میں واپس آئی ہوں تو انھیں سلام کرنے تو جا ہی سکتی ہوں، جب ان سے ملی تو انھوں نے مجھے آپ کے بارے میں سب بتایا کہ آپ میرے جانے کے بعد انکل آنٹی اور نانو کے ساتھ رشتہ لے کر آئے تھے۔ میں آپ سے ملنا چاہ رہی تھی کہ آپ کل شام مجھے مل ہی گئے۔ اب بتائیں ایسے شخص کو نکاح کے لیے کیسے انکار کروں جو مجھے میری کمیوں کے ساتھ قبول کرنے کو تیار تھا۔''

روشان کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ آگئی۔

''تھینک یو جزا، میری زندگی میں آنے کے لیے۔'' وہ مسکرائی اور کچھ دنوں بعد ہی ان کی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

❒❖❒

Ms. Nilofar sadiya
Block No: 2/11
Classic General Store,
Labour Colony,
Nanded, Waghala-431602 (M.S)

ابوطالب انصاری

تل: دربار حسن

انسانی جسم اور چہرہ فطرت کی ایک نادر تخلیق ہیں، جن پر موجود ہر نقش و نگار اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ انہی قدرتی نشانات میں تل بھی شامل ہیں جو کبھی حسن کی علامت سمجھے جاتے ہیں اور کبھی طبی توجہ کا سبب بنتے ہیں۔ چہرے پر موجود تل بعض اوقات شخصیت کو نکھار دیتے ہیں، جبکہ جسم پر پائے جانے والے تل انسانی صحت کے بارے میں اہم اشارے بھی دے سکتے ہیں۔ اسی لیے تل کو صرف ظاہری خوبصورتی کے زاویے سے نہیں بلکہ سائنسی اور طبی نقط نظر سے بھی سمجھنا ضروری ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں چہرے اور جسم پر پائے جانے والے تلوں کی نوعیت، اہمیت اور ان کے حسن و صحت سے تعلق پر روشنی ڈالی جائے گی۔

تل اور قیافہ شناسی:

قدیم زمانے سے قیافہ شناسی (Physiognomy) میں انسانی چہرے اور جسم پر موجود نشانات کو شخصیت، مزاج اور قسمت سے جوڑا جاتا رہا ہے۔ قیافہ شناسوں کے مطابق تل صرف جلد کا نشان نہیں بلکہ انسان کی باطنی کیفیت، رجحانات اور زندگی کے نشیب و فراز کا اشاریہ ہوتے ہیں۔ تل کا مقام، رنگ، سائز اور ابھار سب اپنی اپنی علامتی معنویت رکھتے ہیں۔

پیشانی پر تل

- عقل، قیادت اور بلند حوصلگی کی علامت ہے۔
- دائیں جانب تل: معاشی کامیابی اور عزت
- بائیں جانب تل: تخلیقی ذہن اور سفر کا رجحان
- درمیان میں تل: غیر معمولی قسمت اور اثر و رسوخ

بھنوؤں کے تل۔

- یہ مقام ذہانت اور اندرونی بصیرت سے منسوب ہے۔
- بھنوؤں کے اندر چھپا تل: دولت اور خوش حالی
- دونوں بھنوؤں کے درمیان تل: شہرت یا آزمائشوں بھری زندگی

آنکھ کے تل۔

- آنکھ کے اوپر تل: ،جذباتی حساسیت
- آنکھ کے نیچے تل، رنج، محبت میں ناکامی یا آنسو
- دائیں آنکھ کے پاس، سماجی مقبولیت
- بائیں آنکھ کے پاس، ازدواجی پیچیدگیاں

ناک پر تل

- ناک عزتِ نفس اور رزق سے جڑی سمجھی جاتی ہے۔
- ناک کی نوک پر تل، دلکشی مگر جلد غصہ
- ناک کے دائیں جانب، کاروباری فائدہ
- بائیں جانب، مالی اتار چڑھاؤ

ہونٹوں کے تل

- اوپر کے ہونٹ پر تل، خوش گفتاری اور رومان پسند طبیعت
- نچلے ہونٹ پر تل، کھانے پینے اور آسائش کا شوق
- ہونٹ کے کنارے، حاضر جوابی اور لوگوں پر اثر

تھوڑی کے تل

- ٹھوڑی استقلال اور عملی زندگی کی علامت ہے۔

نیا

- ٹھوڑی کے درمیان تل، مضبوط ارادہ
- دائیں جانب، گھریلو سکون
- بائیں جانب، ذمے داریوں کا بوجھ

گردن پر تل

- سامنے کی طرف، شہرت اور گفتگو کی صلاحیت
- پیچھے کی طرف، ضد یا ماضی سے وابستگی

کندھوں پر تل

- یہ ذمے داری اور محنت کی علامت مانا جاتا ہے۔
- دائیں کندھے پر، کامیابی کے مواقع
- بائیں کندھے پر، زندگی میں جدوجہد

سینے پر تل

- مردوں میں، جرات اور خوداعتمادی
- عورتوں میں، محبت، کشش اور جذبات

پیٹھ پر تل

- یہ بوجھ اٹھانے اور صبر کی علامت ہے، مگر بعض قیافہ شناس اسے تنہائی سے بھی جوڑتے ہیں۔

پیٹ پر تل

- رزق، اولاد اور گھریلو زندگی سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔
- ناف کے قریب: خوش حالی اور نسل کی افزائش
- ہاتھوں پر تل اور گھریلو زندگی سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔
- ناف کے قریب: خوش حالی اور نسل کی افزائش

ہاتھوں پر تل

- ہتھیلی پر تل، قسمت کا ساتھ
- انگلیوں پر تل، ہنرمندی یا فنونِ لطیفہ سے لگاؤ

ٹانگوں اور پاؤں پر تل

- ران پر تل، سفر اور نقل مکانی
- گھٹنے پر تل، قیادت یا جلد بازی
- پاؤں کے تلوے پر تل، دنیا دیکھنے کا شوق اور کامیاب سفر

سیاہ تل، گہری سوچ اور مضبوط شخصیت۔ سرخی مائل تل: جذباتی اور جلد متاثر ہونے والی طبیعت۔ ابھرا ہوا تل، نمایاں زندگی کے واقعات۔ چپٹا تل، خاموش مگر بااثر کردار۔ قیافہ شناسی میں تلوں کی یہ تعبیریں صدیوں پرانی روایات اور مشاہدات کا نتیجہ ہیں۔ اگرچہ یہ سائنسی طور پر ثابت نہیں، مگر ثقافتی اور ادبی اعتبار سے ان کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ تل انسان کی شخصیت کا ایک پہلو ضرور ہو سکتے ہیں، مگر اصل پہچان اس کے کردار، اعمال اور اخلاق سے ہوتی ہے۔

تل اور حسن

حسن ہمیشہ سے محض تناسب یا رنگت کا نام نہیں رہا، بلکہ وہ ان باریک نشانات کا مجموعہ ہے جو چہرے اور جسم کو انفرادیت بخشتے ہیں۔ تل انہی قدرتی نشانیوں میں سے ایک ہے جو بظاہر معمولی ہونے کے باوجود حسن میں گہرا اضافہ کرتا ہے۔ بعض اوقات ایک چھوٹا سا تل پورے چہرے کی کشش کا مرکز بن جاتا ہے اور شخصیت کو یادگار بنا دیتا ہے۔ چہرہ انسانی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے، اور اس پر موجود تل اکثر خوبصورتی کی مہر سمجھے جاتے ہیں۔ آنکھ کے قریب یا گال پر موجود تل نگاہوں کو ٹھہرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہونٹ کے کنارے یا اوپر کا تل مسکراہٹ میں دلکشی پیدا کرتا ہے۔ ناک یا ٹھوڑی پر تل چہرے کو توازن اور انفرادیت بخشتا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا بھر میں بہت سی مشہور شخصیات نے اپنے تل کو چھپانے کے بجائے اسے اپنی شناخت بنایا، کیونکہ یہ نشان حسن کو مصنوعی نہیں بلکہ فطری بناتا ہے۔

قدیم تہذیبوں میں تل کو محض ایک جسمانی نشان نہیں بلکہ حسن کی تکمیل سمجھا جاتا تھا۔ شاعری اور ادب میں محبوب کے تل کو چاند پر لگے داغ سے تشبیہ دی گئی، ایسا داغ جو چاند کی خوبصورتی کو کم نہیں بلکہ بڑھا دیتا ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں ''خال'' کو عشق، کشش اور فتنہ انگیزی کی علامت بنایا گیا، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تل حسن کے تصور میں کس قدر گہرائی سے شامل رہا ہے۔ صرف چہرہ ہی نہیں، بلکہ جسم پر موجود تل بھی حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ گردن یا کندھے پر تل نزاکت اور وقار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ہاتھ یا کلائی پر تل لطافت اور نسوانیت یا نفاستِ طبع کو ظاہر کرتا ہے۔ بعض ثقافتوں میں پیٹھ یا پہلو پر تل کو پوشیدہ حسن کہا جاتا ہے، جو صرف

خاص نظر کو ہی دکھائی دیتا ہے۔ یہ تل جسمانی حسن میں ایک رازدارانہ کشش پیدا کرتے ہیں، جو ظاہری خوبصورتی کو گہرائی عطا کرتی ہے۔ حسنِ فطری میں تل کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ یہ بناوٹ سے پاک ہوتا ہے۔ میک اپ، زیورات اور لباس وقتی سجاوٹ ہیں، مگر تل قدرت کی طرف سے عطا کردہ ایسا نشان ہے جو انسان کو منفرد بناتا ہے۔ اسی لیے جدید دور میں بھی ''فطری حسن'' کے تصور کے ساتھ تل کو قبول کیا جا رہا ہے، اور بہت سے لوگ اسے مٹانے کے بجائے نمایاں رکھنا پسند کرتے ہیں۔

طبی اعتبار سے تل:

تل کو Nevus کہا جاتا ہے۔ یہ جلد پر موجود وہ دھبے یا ابھار ہوتے ہیں جو میلانوسائٹس (Melanocytes) نامی خلیات کے جمع ہونے سے بنتے ہیں۔ یہی خلیات جلد کے رنگ (Melanin) کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ تل پیدائشی بھی ہو سکتے ہیں اور عمر کے مختلف مراحل میں بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔

وجوہات:

جینیاتی اثرات۔ اگر والدین میں تل زیادہ ہوں تو اولاد میں بھی تل ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

سورج کی شعاعیں۔ سورج کی بالائے بنفشی شعاعیں (UV Rays) جلد کے خلیات کو متاثر کرتی ہیں، جس سے نئے تل بن سکتے ہیں یا موجودہ تل گہرے ہو سکتے ہیں۔

ہارمونل تبدیلیاں۔ بلوغت، حمل اور بعض اوقات ہارمونل ادویات کے استعمال سے تل نمایاں ہو سکتے ہیں۔

عمر کا اثر۔ عموماً بچپن اور جوانی میں تل زیادہ بنتے ہیں، جبکہ بڑھتی عمر میں بعض تل مدھم بھی پڑ سکتے ہیں۔

تل کی اقسام:

● عام تل (Common Moles)۔ یہ عموماً بے ضرر ہوتے ہیں، گول یا بیضوی شکل کے اور ہموار کناروں والے ہوتے ہیں۔

● پیدائشی تل (Congenital Nevi)۔ یہ پیدائش کے وقت موجود ہوتے ہیں۔ بڑے سائز کے پیدائشی تل پر خصوصی توجہ ضروری ہوتی ہے۔

● غیر معمولی تل (Dysplastic Nevi)۔ یہ بے قاعدہ شکل یا مختلف رنگ رکھتے ہیں اور ان پر نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

● خطرناک تل کی علامات (ABCDE اصول)۔ بعض صورتوں میں تل Melanoma نامی خطرناک جلدی سرطان میں تبدیل ہو سکتے ہیں، اگرچہ یہ بہت کم ہوتا ہے۔ بروقت تشخیص سے اس بیماری کا کامیاب علاج ممکن ہے، اسی لیے تلوں پر نظر رکھنا طبی لحاظ سے نہایت اہم ہے۔

تل ہٹانے کا طبی پہلو:

- تل کو صرف حسن کی خاطر ہٹانا بعض اوقات نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔
- اگر طبی خطرہ ہو تو ڈاکٹر سرجری، لیزر یا دیگر محفوظ طریقے استعمال کرتے ہیں۔
- گھریلو ٹوٹکے یا غیر سائنسی طریقے شدید نقصان کا باعث بن سکتے ہیں۔

احتیاطی تدابیر:

- دھوپ میں نکلتے وقت سن اسکرین کا استعمال
- تل کو بار بار کھرچنے یا زخمی کرنے سے گریز
- بچوں اور بڑوں دونوں میں تلوں کی باقاعدہ نگرانی
- کسی بھی تبدیلی کی صورت میں خود علاج کے بجائے ڈاکٹر سے مشورہ

طبی نقطۂ نظر سے تل زیادہ تر ایک فطری اور بے ضرر علامت ہیں، مگر ان پر نظر رکھنا صحت کے لیے ضروری ہے۔ حسن کے زاویے سے قابلِ قبول تل بھی اگر طبی خطرہ بن جائیں تو انہیں نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ تل کا معاملہ حسن، روایت اور صحت، تینوں کے توازن کا متقاضی ہے۔

Dr. Abu Talib Ansari
187,Ghouri Pada
Bhiwandi, Thane-421308 (M.S)
drabutalibansari@gmail.com

خواتین خبرنامہ

گلاسگو 2026: میرابائی چانو نے ویٹ لفٹنگ میں تاریخ رقم کی، ہندوستان کا پہلا طلائی تمغا جیتا

گلاسگو (اسکاٹ لینڈ): اسٹار ویٹ لفٹر سائکھوم میرابائی چانو نے اتوار کو گلاسگو کامن ویلتھ گیمز میں خواتین کے 48 کلوگرام زمرے میں ریکارڈ وزن اٹھا کر ہندوستان کا گولڈ میڈل کا کھاتہ کھول دیا۔ 31 سالہ میرابائی نے اسنیچ میں 85 کلو وزن اٹھایا اور دولت مشترکہ کھیلوں کے لیے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔

اس کے بعد انھوں نے کلین اینڈ جرک میں 105 کلوگرام وزن اٹھا کر کامن ویلتھ گیمز کا ایک اور ریکارڈ قائم کیا۔ یہ میرابائی کا مسلسل تیسرا دولت مشترکہ کھیلوں کا طلائی تمغا ہے، جو اس سے قبل 2018 اور 2022 کے ایڈیشنز میں طلائی تمغا جیت چکی ہیں۔ ٹوکیو اولمپک کی چاندی کا تمغا جیتنے والی میرابائی نے گلاسگو میں 2014 کے دولت مشترکہ کھیلوں میں بھی چاندی کا تمغا جیتا تھا۔

وزیر اعظم نریندر مودی نے سوشل میڈیا پر پوسٹ کر کے انھیں مبارکباد دی۔ انھوں نے لکھا،" ہندوستانی ویٹ لفٹنگ میں ایک اور شاندار باب! باصلاحیت میرابائی چانو نے ایک بار پھر شاندار کارکردگی کے ساتھ دولت مشترکہ کھیلوں میں 48 کلوگرام زمرے میں طلائی تمغا جیت کر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔

(ای ٹی وی بھارت،26 جولائی 2026)

شوٹنگ میں ایشا سنگھ نے 25 میٹر پسٹل مقابے میں جیتا سلور

ٹویوٹا: ہندوستان کی نشانے باز ایشا سنگھ نے پیر کے روز ایشین گیمز 2026 میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خواتین کے 25 میٹر پسٹل مقابلے میں سلور میڈل اپنے نام کیا۔ شدید دباؤ کے درمیان ایشا نے غیر معمولی ذہنی توازن کا مظاہرہ کیا۔ مقابلے کے دوران انہیں کئی مرتبہ مشکل شوٹ آف کا سامنا کرنا پڑا، لیکن انھوں نے اپنی توجہ برقرار رکھتے ہوئے مضبوط عزم کے ساتھ دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ایشین گیمز میں ایشا کا یہ تیسرا سلور میڈل ہے۔ اس سے قبل انھوں نے ہانگژو 2023 میں 10 میٹر ایئر پسٹل کے انفرادی اور ٹیم مقابلوں میں چاندی کے تمغے جیتے تھے۔ ایشا نے 580-22x کے اسکور کے ساتھ آٹھویں پوزیشن پر رہتے ہوئے مشکل سے فائنل کے لیے کوالیفائی کیا تھا، تاہم میڈل راؤنڈ شروع ہوتے ہی ہندوستانی نشانے باز نے ابتدائی مشکلات کو پیچھے چھوڑ دیا۔ انھوں نے فائنل کے آغاز میں اپنے پانچوں شاٹس پر پانچوں درست نشانے لگائے۔

سخت مقابلے کے درمیان شاندار واپسی:

ابتدائی مرحلے میں ایشا ٹاپ کھلاڑیوں میں شامل رہیں، تاہم سرفہرست پوزیشن کے لیے مقابلہ مسلسل سخت ہوتا گیا۔
ایشا کا سلور میڈل ہندوستان کے لیے شوٹنگ رینج میں ایک سنسنی

خیز صبح کا اختتام ثابت ہوا۔

(بھارت ایکسپریس اردو،28a ستمبر 2026)

ایشیائی کھیل 2026: گیارہویں دن بھارت کا سنہرا آغاز، تیر اندازی ٹیم نے جیتا دوسرا گولڈ میڈل

ناگویا، آئچی، جاپان: جاپان کے شہر آئچی-ناگویا میں جاری ایشین گیمز 2026 کے 11ویں دن بھارتی کھلاڑیوں نے غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دن کا شاندار آغاز کیا ہے۔ تیر اندازی (آرچری) کے مقابلوں میں بھارتی خواتین کی کمپاؤنڈ ٹیم نے، جس میں جیوتی سریکھا وینم، پرتھیما پردیپ اور چکیتھا تانی پارتھی شامل تھیں، فائنل میں چین کو 234 کے مقابلے میں 238 پوائنٹس سے شکست دے کر طلائی تمغا اپنے نام کرلیا۔

اس تاریخی جیت کے دوران بھارتی خواتین نے عالمی ریکارڈ کے برابر اسکور کر کے اپنی بالادستی ثابت کی۔ اس بڑی کامیابی کے فوراً بعد، کمپاؤنڈ مکسڈ ٹیم ایونٹ میں بھی چکیتھا تانی پارتھی اور ساحل جادھو پر مشتمل جوڑی نے سنسنی خیز مقابلے کے بعد جنوبی کوریا کو ہرا کر ملک کے لیے ایک اور گولڈ میڈل جیت لیا۔

ایشین گیمز میں بھارت کے گولڈ میڈلز کی مجموعی تعداد بڑھی

ان دونوں متواتر فتوحات کے نتیجے میں جاری ایشین گیمز میں بھارت کے گولڈ میڈلز کی مجموعی تعداد بڑھ کر 8 ہوگئی ہے، جس نے میڈل ٹیبل پر ملک کی پوزیشن کو مزید مستحکم کر دیا ہے۔ تیر اندازی کے زمرے میں بھارت کے لیے یہ دن انتہائی یادگار ثابت ہوا کیونکہ یہ جاری ٹورنامنٹ کے دوران آرچری کے مقابلوں میں بھارت کا مجموعی طور پر دوسرا اور تیسرا گولڈ میڈل ہے۔ مکسڈ ٹیم کی اس کامیابی نے نہ صرف بھارت کے تمغوں کی تعداد میں اضافہ کیا بلکہ لاس اینجلس 2028 اولمپکس کے لیے کمپاؤنڈ مکسڈ ٹیم کا کوٹا بھی حاصل کر لیا۔ کھلاڑیوں کی اس شاندار کارکردگی پر ملک بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے اور کھیلوں کے ماہرین اسے بھارتی تیر اندازی کا ایک سنہری دور قرار دے رہے ہیں۔

بھارتی کمپاؤنڈ مکسڈ ٹیم نے جیتا گولڈ

خواتین کی کمپاؤنڈ ٹیم کے گولڈ میڈل جیتنے کے بعد بھارتی کمپاؤنڈ مکسڈ ٹیم نے بھی گولڈ میڈل پر مہر لگا دی۔ ساحل راجیش جادھو اور چکیتا تانی پارتھی کی بھارتی مکسڈ کمپاؤنڈ ٹیم نے جنوبی کوریا کو شوٹ آف (Shoot-off) میں شکست دے کر یہ گولڈ میڈل جیتا۔ اس تاریخی فتح کے ساتھ ہی انہوں نے اولمپک 2028 کا کوٹا بھی حاصل کر لیا ہے۔ اس سے قبل جادھو اور تنیپارتھی نے تھائی لینڈ کو 155 کے مقابلے میں 156 پوائنٹس سے ہرا کر فائنل میں جگہ بنائی تھی۔

بھارتی خاتون کمپاؤنڈ تیر اندازی ٹیم نے جیتا گولڈ میڈل

چکیتا تانی پارتھی، پرتھیلا پردیپ اور جیوتی سریکھا وینم پر مشتمل بھارتی کمپاؤنڈ تیر اندازی ٹیم نے چین کو 234 کے مقابلے میں 238 پوائنٹس سے ہرا کر اپنے گولڈ میڈل کا کامیابی سے دفاع کیا۔ بھارت نے 2018 میں اس ایونٹ میں سلور اور 2014 میں برانز میڈل جیتا تھا۔ فائنل میں شکست کے بعد چین کی ٹیم نے سلور میڈل حاصل کیا، جب کہ جنوبی کوریا کی ٹیم نے چینی تاپے (تائیوان) کو ہرا کر برانز میڈل اپنے نام کیا۔ (ای ٹی وی بھارت،30 ستمبر 2026)

ارتباط

مدیر مکرم! ماہنامہ خواتین دنیا، دہلی

ستمبر کا موقر رسالہ ہاتھ میں ہے، مشمولات کا تنوع مختلف جہان کی سیر کراتا ہے۔ جہاں شخصیات کا تعارف ہے وہیں مذکورہ شخصیات کے علم وادب اور فن سے آگہی کا وسیلہ بھی ہے بانو سرتاج پر شمع اختر کاظمی کا مضمون بانو سرتاج کے تخلیق ادب اطفال پر ایک اعتبار و استناد کی ضمانت ہے۔

ماہنامہ خواتین دنیا کا اعتبار اس لیے مزید بڑھ جاتا ہے کہ اس کے مشمولات میں یا تو خواتین پر تحریر ملتی ہے یا پھر خواتین کی تحریریں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی قلمکار مرد بھی ہے تو وہ عورت کے علم وفن کو اجاگر کرتا ہے۔ گویا یہ رسالہ ماضی کی خواتین قلمکاروں کو متعارف کراتا ہے یا موجود خواتین قلمکاروں کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

یہ رسالہ نظم ونثر دونوں کے لیے مساوی موقع دیتا ہے، تاکہ قارئین خواتین نثر نگاروں اور تخلیق کاروں سے واقف ہوں۔ نیز ان کی ادبی خدمات سے روبرو ہوسکیں۔ شمع اختر کاظمی، مہتاب جہاں، شبانہ عشرت، واجدہ کوثر، شہناز خاتون، افزا خاتون اور عقیلہ کی تحریریں ادب میں ایک اضافہ ہے۔

محی الدین زور کشمیری، عمران عاکف خان، ندیم علی نے ادب وثقافت اور تہذیب کے جن گوشوں کا انتخاب کیا ہے اس سے قارئین کو ذہنی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان تینوں قلمکاروں کی تحریریں ماضی، ماضی قریب اور حال کے ادبی رویے کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہیں ہما کا مضمون یاور وارثی کی نعتیہ شاعری میں بوقلمونی حسن ادارتی کا مرقع ہے۔ تمام قلمکاروں نے اپنے منتجہ عناوین کے لیے انتخاب واقتباس بھی نقل کیا ہے جس سے زیر تحریر شخصیات کو اعتبار حاصل ہوتا ہے۔

عافیہ ثاقب، شاہین باغ، دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تازہ مطبوعات

ادبیات شناسی

مصنف: محمد حسن

دوسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 192

قیمت: 120 روپے

زبان اور علم زبان

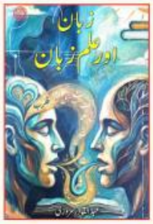

مصنف: عبدالقادر سروری

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 270+XVII

قیمت: 190 روپے

سہانی دھوپ

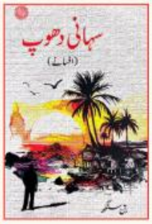

مصنف: رتن سنگھ

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 494+IX

قیمت: 305 روپے

جراحیاتِ نظامی

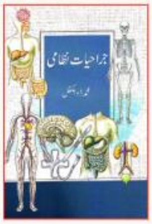

مصنف: محمد ذوالکفل

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 358+IV

قیمت: 275 روپے

خواتین واطفال سے متعلق قوانین (جلد اوّل: خواتین سے متعلق قوانین)

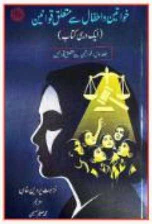

مصنفہ: نزہت پروین خان

مترجم: محمد صغیر حسین

پہلی ایڈیشن: 2026

صفحات: 678+X

قیمت: 405 روپے

خواتین واطفال سے متعلق قوانین (جلد دوم: اطفال سے متعلق قوانین)

مصنفہ: نزہت پروین خان

مترجم: محمد صغیر حسین

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 318

قیمت: 210 روپے

منجدھار میں دھار

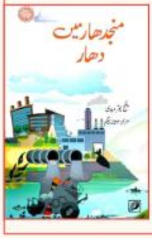

مصنف: پنکج چترویدی

مترجم: ممتاز بیگم

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 178+XXII

قیمت: 280 روپے

زراعت کو آب وہوا میں ہونے والی تبدیلی کے مطابق بنانا

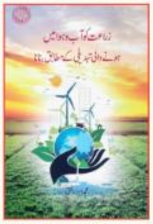

مصنف: محمد اسرار الحق

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 72+XVI

قیمت: 120 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, अक्तूबर-२०२६ वर्ष: १०, अंक: १०
Mahnama Khawateen Duniya Monthly October 2026, Vol.10 Issue: 10
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-10-2026
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

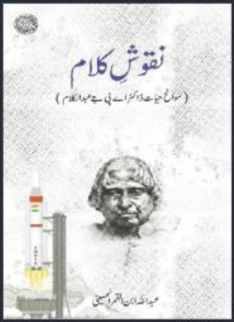

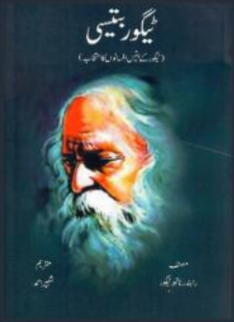

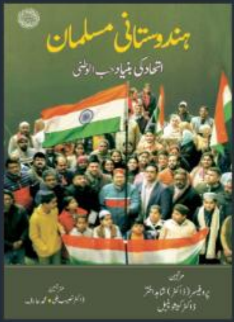

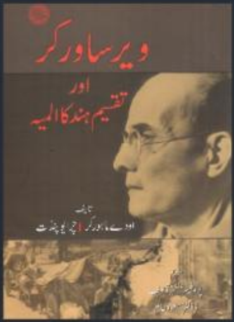

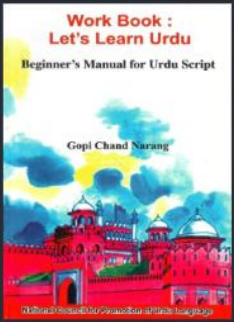

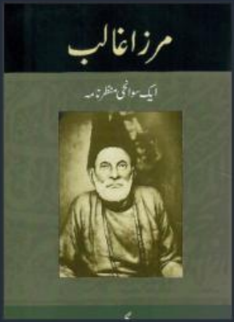

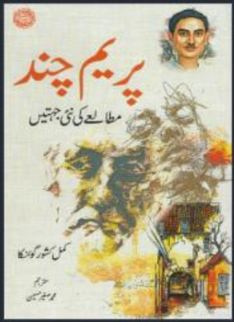

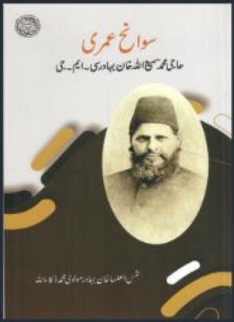

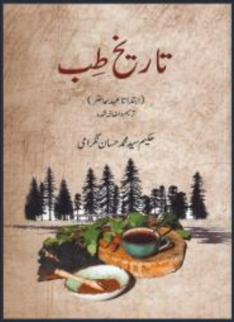

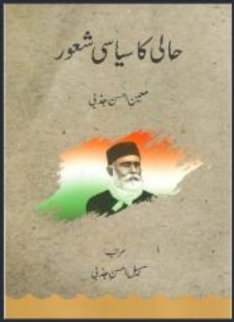

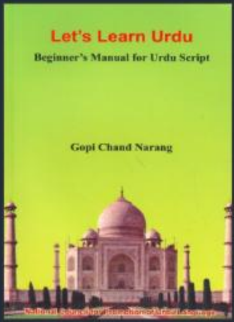

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B-127, Sector 65, Noida-201301 (U.P)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025